

اسلامی قانون میراث اور تقسیم پوتے کی محرومی

(قانون شرعیہ کی ایک خالص فقہی بحث)

نعیم صدیقی

ادھر چند روز سے اسلامی قانون میراث کے ایک اہم مسئلے یعنی میت کے بیٹوں کی موجودگی میں تقسیم پوتے کے حرمان کے بارے میں ایک دلچسپ بحث اٹھ کھڑی ہوئی ہے۔ لیکن بجائے اس کے کہ یہ بحث سنجیدہ اور سائنٹفک طریق پر جاری ہوتی، یہ اخباری پروپیگنڈے کی گوسٹے چوگاں بن گئی ہے ہم چاہتے ہیں کہ پیش نظر مسئلہ کی فنی نوعیت کو، اور اس پر ہونے والی بحث کے محرکات کو پوری طرح سمجھ کر اسے سنجیدہ غور و فکر سے حل کیا جائے۔

چند تمہیدی باتیں

بحث کی ابتداء | اس بحث کا دواڑہ اول اول مسلمانوں میں اس وقت کھلا ہے جب سے انگریزی حکومت کے تحت ہندوستانہ رواجی قانون وراثت نافذ ہوا۔ رواجی قانون سے جہاں مسلمانوں نے یہ اثر لیا کہ لڑکیوں کو بالکل محروم الارث کر کے رکھ دیا اور لڑکیوں کو شریعت کے دیئے ہوئے حق وراثت سے محروم کرنے ہی کے لیے وراثت کے شرعی قانون پر مسلمان کھلم کھلا رواجی قانون کو ترجیح دیتے رہتے ہیں، نیز قانون شریعت کے نفاذ کے بعد بھی لڑکیوں اور بہنوں سے دستبرداری کے بیانات دلوادلو کر ان کی حق ماری کتے رہے ہیں) وہاں ان میں میت کے زندہ بیٹوں کے حصص کے ساتھ اس کے مردہ بیٹوں کے حصص کو زندہ رکھ کر تقسیم پوتوں کو وراثت قرار دینے کی تڑپ بھی پیدا ہو گئی۔ چنانچہ کسی کی بیوہ بہن، تقسیم بھانجی یا نواسی،

اس بحث کے ایک بڑے محرک (SPONSOR) یعنی مولانا اسلم حیرا چوری نے بھی اسی حقیقت کی طرف

اشارہ کیا ہے کہ بیشمار لوگ جنہوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد بھی وراثت میں سابق خاندانی معمول کو بحال رکھا، ان کے لیے اسلامی قانون کو جذب کرنا انہوں کو موجب ہوا ہے۔

بلکہ خود یتیم پوتے کی ماں یعنی بیوہ بہو کے لیے کوئی بھرتی پیدا نہیں ہوتی۔ ساری توجہ یتیم پوتے کے ایک ہی مسئلے پر مرکوز ہے۔ اس سے پہلے پوری تاریخ اسلام و مسلمین میں اس بھرتی کے آثار نہیں ملتے۔

اس بحث کو باقاعدہ بحث بنانے کا کارنامہ منکرین حدیث کے مدرسہ فکر نے انجام دیا ہے۔ ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ چونکہ ملاؤں نے سازش کر کے قرآن کے ساتھ ایک وسیع من گھڑت سرمایہ روایات کو بھی حدیث نبوی اور سنت نبوی کے نام سے بہ حیثیت ماخذ قانون کے لاشامل کیا ہے اس وجہ سے ان کا فقہی نظام قانون الہی سے انحراف کر کے کچھ کا کچھ بن گیا ہے، اور اس کے ہر شعبے میں مضحکہ خیز اور لائسنس چھیدگیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ اب ان مضحکہ خیز پیچیدگیوں کے بقاء کی وجہ یہ ہے کہ سلف نے جو کچھ کہہ دیا، بعد کے لوگ بے سوچے سمجھے کبھی پرکھی مارتے چلے آ رہے ہیں۔ چنانچہ اس مدرسہ فکر کے متوسلین نظام فقہ میں سے کرید کرید کر ایسے مسائل بحث برآمد کرتے رہتے ہیں جن کی اصولی بنیادوں اور جن کی فنی حیثیت کو تو عوام جانتے نہیں، اور نہ جن کے محل وقوع کو اسلامی نظام فکر و قانون کے مجموعی ڈھانچے (SET-UP) میں وہ متعین کر سکتے ہیں، اور پھر ان مسائل بحث سے پیدا ہونے والے اشکالات اور پیچیدگیوں کو جو دنیا کے ہر قانونی نظام کی تفصیل میں کچھ نہ کچھ بہر حال ہوتی ہیں۔ نمک مرچ لگا کر اس انداز سے پیش کرتے ہیں کہ لوگوں میں انتشار نمودار ہو جائے۔ اس انتشار سے اشکالات اور پیچیدگیوں کو اہل نظام فکر و قانون کے اندر رہ کر حل کرنا مطلوب نہیں، بلکہ اصل مطلوب حدیث اور سنت کے خلاف معرکہ جاری رکھنا ہے۔ سوال یتیم پوتے کو میراث دلوانے کا نہیں، بلکہ سنت کے ترکہ نبوت سے امت کو محروم اللہ کرنے کا ہے۔

حدیث کو مٹائی سازش قرار دے کر جس بھی مسئلے کی آڑ میں قدیم علمائے اسلام اور جدید مفکرین کتابت سنت کے خلاف محاذ بنایا جائے، بہر حال الہامی لیسنڈر (SECTARIST) عناصر کی بنیاد ہے۔ چنانچہ یتیم پوتے کی میراث کے مسئلے پر اخبارات میں ایسے بہت سے لوگ طبع آزمائی فرما رہے ہیں جو منکرین حدیث سے دو قدم آگے بڑھ کر سرے سے دین و مذہب کے وجود پر حملہ آور ہونا چاہتے ہیں۔ تیسری طرف ہمارے ایم، ایل، اے صاحبان ہیں کہ جو شریعت اسلامیہ کے نظام فکر و قانون پر ایمان

رکھنے یا اس کا ضروری علم حاصل کرنے کے لحاظ سے چاہے کسی بھی سطح پر ہوں، لیکن وہ اس کے بنائے اور
 بگاڑنے کا اختیار ضرور رکھتے ہیں۔ اسمبلی کی رکنیت ان کو جو اختیارات دیتی ہے ان کے استعمال کی جو
 تربیت اب تک ہمارے ایم، ایل اے حضرات کو مل ہے وہ یہ ہے کہ کبھی کبھی وہ ذاتی اور خاندانی مفاد
 کی خدمت کے ساتھ اپنی ساکھ بنانے کے لیے کچھ "شاندار کارنامے" بھی سرانجام دینا چاہتے ہیں۔ چنانچہ عوام
 خصوصاً اپنے حلقے کے ووٹروں کی خواہشات اور نفسیات کو سامنے رکھ کر ان کو خوش کرنے والا کوئی مسودہ
 قانون پیش کر دیتے ہیں۔ یہ مشق عام دنیاوی مباحات کے دائرے میں تو جاری تھی ہی، اب خود اسلام
 اور شریعت سے بھی یہ دل لگی ہونے لگی ہے۔

چنانچہ نیم پوتے کو چچاؤں کے پہلو پہ پہلو وراثت دلوانے کے لیے جو خواہش ہمارے عوام۔ بالخصوص
 زرعی آبادی کے حلقوں میں کارفرما ہے، اسے اقبال جیمہ صاحب نے اچھی طرح بھانپ کر منکرین حدیث
 کے استدلال کو سامنے رکھتے ہوئے مسلمانوں کے شرعی قانون وراثت میں ترمیم کے لیے ایک مسودہ
 قانون پنجاب اسمبلی میں مانع دیا ہے۔ یہ ترمیمی مسودہ قانون اب چونکہ رائے عام معلوم کرنے کے لیے
 متعلق چھوڑا گیا ہے، اس لیے منکرین حدیث، مخالفین دین عناصر، عام متقابلہ مفکار بلکہ خطوط نگار اخبارات
 میں اس مسئلہ پر طبع آزمائی کر رہے ہیں اور بحث بالکل عامیانہ سطح پر آگری ہے۔

اگر آپ اس بحث میں حصہ لینے والوں کا تجربہ کریں تو حسب ذیل عناصر سامنے آئیں گے۔
 ایک گروہ اس مسئلے کے موقف سے حدیث اور سنت کے خلاف معرکہ آرا ہے۔
 ایک گروہ اس بحث کے ذریعے "ملازم" کے خلاف جہاد میں مصروف ہے۔

ایک گروہ اس جھگڑے کی آٹھیں سرے سے دین و مذہب ہی کے خلاف ایک فضا پیدا کرنے
 میں مصروف ہے۔

ایک عنصر محض زرعی آبادی کے ووٹروں کو خوش کرنے کے واسطے ہے۔

ان عناصر کے علاوہ کچھ لوگ یقیناً ایسے بھی ہیں جو دیانت داری سے نیم پوتے کے مسئلے کو سمجھنا

چاہتے ہیں، اور جو اشکال اس میں مانع ہوا ہے اس کا کوئی حل شریعت اسلامی کی رہنمائی میں

پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

بحث کی دو صورتیں | ان سب عناصر کو سامنے رکھتے ہوئے ہم یہ گزارش کریں گے کہ بحث کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں:-

ایک صورت یہ ہے کہ آپ اسلام کو اپنا دین مانتے ہوں، قرآن اور سنت دونوں کو شریعت کے ماخذ کی حیثیت دیتے ہوں، اور پھر سوال یہ چھڑیں کہ ان ماخذ سے فقہ اور اتسباط اور اجتہاد کے جو قانون بنایا گیا ہے اس میں ایک یا چند مسائل میں ماہرین کی فکر نے کوتاہی کی ہے، یا اصولوں کو عملی تفصیل پر منطبق کرنے میں سہو ہو گیا ہے، لہذا اب از سر نو غور کر کے کسی اشکال یا پیچیدگی کو اسلامی نظام فقہ و قانون کے اندر رکھ کر حل کیا جائے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ آپ سرے سے اسلام کو بہ حیثیت نظام زندگی کے مانتے ہی نہ ہوں یا اسے ایک یادگار کہن سمجھتے ہوں، یا صرف قرآن کو سند تسلیم کریں اور قرآن کی عملی تشریح کی حیثیت سے سنت نبوی کو ماخذ قانون مانتے ہی میں اصولی اختلاف رکھتے ہوں، اور اس رٹے کے نتیجے میں یہ سمجھتے ہوں کہ پورا نظام شریعت ہی غلط بن گیا ہے، یا آپ فقہ و قانون کو ملائی خرافات قرار دیں اور اپنے ان نظریات کے لیے جنگ لڑنے میں تیمم پتنے کی میراث کے مسئلے کو محض آلہ اور ذریعہ بنا کر استعمال کریں، یا یہ کہ اسے محض بطور مثال یا دلیل سامنے لائیں۔

اگر صورتِ بحث دوسری ہو تو پھر ایک جزئی مسئلہ اگر آپ کے حسبِ منشا بھی حل کر لیا جائے، یا اس کے برعکس اس کی صحت و معقولیت خود آپ کی سمجھ میں بھی آجائے تو طبیی اصل بنیادی جھگڑا جس کا میدان بڑا وسیع ہے جوں کا توں باقی رہتا ہے۔ ایک جزئی مسئلہ طے ہو جانے کے بعد وہ بنیادی جھگڑا پھر کسی اور جزئی مسئلے میں چھڑ جائے گا۔ لہذا بہتر یہ ہے کہ بنیادی اختلاف رکھنے والے حضرات اپنی ذاتی بنیادی بحث ہی کے میدان میں لڑیں۔ پھر اگر اختلاف رفع ہو جائے تو بہت خوب، ورنہ وہ جس دوسرے نظام فقہ و قانون کو چاہیں اختیار کر لیں، اور اسلام کو نظام زندگی مانتے اور قرآن کے ساتھ سنت کو ماخذ تسلیم کرنے والے مسلمانوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیں۔

ہاں، اگر بحیثیت کی صورت پہلی ہو کہ اسلام پر ایمان رکھنے اور قرآن و سنت کو بنیادی ماخذ ماننے میں اور شریعت کے نظام فقہ و قانون پر مجموعی اعتماد رکھنے میں اتفاق ہو اور سارا قضیہ تہیم پوتے کی میراث تک محدود ہو تو پھر ہم اس بحث میں دلچسپی لینا ضروری سمجھتے ہیں۔ اور ہم منکرین حدیث اور محدثین کے محاذ سے قطع نظر کر کے اخلاص مند عنصر کو اصل مخاطب بنا رہے ہیں۔

ہمارا نظام فقہ و قانون اس مسئلے پر جو مناظرانہ اور اخباری بحثیں دیکھنے میں آ رہی ہیں ان کی سطحیت تقاضا کرتی ہے کہ سب سے پہلے اسلامی نظام فقہ و قانون کی مخصوص نوعیت کو واضح کر دیا جائے۔

یہ ایک الہی دینی نظام قانون ہے۔ اس کی بنیادیں خدا و رسول کی مقرر کردہ ہیں اور اس کے نشوونما کے لیے حدود لگا کر راستے مقرر کر دیئے گئے ہیں۔ یہ سبزہ بیگانہ کی طرح ہر طرف نہیں پھیل سکتا، بلکہ منضبط طریق پر ترقی کرتا ہے۔ اس کا میدان بالکل آزاد اور بے قید انسانی تفکر کے جولانیاں دکھانے کا میدان نہیں۔ اس میدان میں قدم دھرتے سے قبل انسانی فکر کو کچھ اصول و حدود کی پابندیاں قبول کرنی پڑتی ہیں، اور خدا و رسول کی دی ہوئی حکمت قانونی پر ایمان لانا پڑتا ہے، نیز اسلامی ماخذ قانون کو اسی ترتیب سے قبول کرنا پڑتا ہے جو ترتیب شارع (LAW GIVER) نے مقرر کر دی ہے۔

یہ نظام قانون ایسا کھلونا بہ ہر حال نہیں ہے کہ اس میں سطحی قسم کے انسانی جذبات جدر سے چاہیں مداخلت کرتے رہیں۔ آج ایک جذبہ کی لہر اٹھی تو آپ نے کہا کہ اس میں فلاں تبدیلی ہونی چاہیے، کل ایک دوسرا جذبہ متحرک ہوا تو آپ تقاضا کرنے لگے کہ اس کا رخ ادھر سے ادھر کو بدل دیا جائے۔ جس کا جو خیال پیدا ہوا اس نے اس کے حق میں پروٹیکٹڈ کیا، رائے عام کو اپنی حمایت میں لیا، ایک مسودہ قانون پیش کر دیا، تقریبیں ہوئیں، رائے شماری عمل میں آئی اور بس ایک نیا ایکٹ بن گیا۔ اور پھر جو بھی نیا ایکٹ بن گیا وہ اسلامی قانون ٹھہرا۔ قانون کو کسی بھی معاشرے نے اس طرح موم کی ناک اور سطحی جذبات کا کھلونا نہیں بننے دیا ہے، لہذا کہ اسلامی نظام فقہ و قانون!

اس نظام فقہ و قانون کے بارے میں دین کے مخالفوں اور منکرین حدیث وغیرہ نے یہ جو تصور پھیلا رکھا ہے کہ عقل سے کام نہ لینے والے چند مسجد گیر ملاؤں کے تیر تیکے پرانی کتابوں میں لکھے چنے آ رہے ہیں

اور بعد کے لوگ لیبر کی فقیری میں مبتلا ہیں، اس تصور کے باسے میں کم سے کم سنجیدہ مزاج اور علمی ذوق رکھنے والوں کو جان لینا چاہیے کہ یہ بازاری قسم کی خرافات سے زائد کچھ نہیں۔ یہ نظام فقہ و قانون جسے آج آپ ایسی کتابوں کے اوراق میں دیکھتے ہیں جو ہماری تعلیم کا ہوں کے نصاب سے خارج اور ہماری حدود مطالعہ سے باہر ہو گئی ہیں، یہ کچھ عرصہ قبل اسی طرح نافذ العمل تھا جس طرح آج اینگلو سکسین نظام قانون ہمارے ہاں رائج ہے۔ یہ باقاعدہ اسلامی ریاست کی مجالس شوریٰ (PARLIMENTS) اور مجالس فقہاء (LAWYER ASSEMBLIES) میں زیر بحث آ کر مدون ہوا ہے، اور ناضل جموں اور قانون دانوں نے اس کے اصولوں کو عدالتوں میں پیش آئند مقدمات پر منطبق کر کے ایک خاص وسعت تک پہنچایا ہے۔ یہ مسجدوں کے حجرہوں میں نہیں، بلکہ حکومت کے ایوانوں، یونیورسٹیوں، تحقیقی اداروں (RESEARCH INSTITUTES) اور عدالتوں کے گہواروں میں ٹھیک اسی شان سے پلا ہے جس شان سے آج کی کسی حکومت کا قانون پروان چڑھتا ہے۔ ایک ایک شعبہ میں اس کے اصول متعین کیے گئے ہیں، حکمتیں اور مصلحتیں سامنے لائی گئی ہیں، فنی اصطلاحات وضع کی گئی ہیں، ایک خاص زبان اس کے لیے نشوونما پائی ہے، اور خاص فنی مسائل اور قانونی پیچیدگیاں بالکل فطری طور پر ابھری ہیں جن پر ماہرین نے وسیع سرمایہ فکر و نظر چھوڑا ہے۔ پھر واقعہ یہ نہیں ہے کہ مکھی پر مکھی ماری گئی ہے بلکہ برعکس اس کے فقہاء اور ماہرین قانون کے درمیان بڑی بڑی اختلافی بحثیں پائی جاتی ہیں، متفقہ اصولوں پر جمع ہونے کے باوجود تفصیل میں آراء کا فرق نمایاں ہے، یہاں تک کہ چار بڑے بڑے مستقل مدارس فکر ہماری فقہ میں پیدا ہو گئے ہیں اور پھر خود ان میں داخلی طور پر بھی اجتہادی اختلافات موجود ہیں۔ بعد میں یہ نظام فقہ و قانون سب نافذ العمل نہ رہا تو اس کا نشوونما اسی طرح رک گیا جس طرح کوئی بھی دوسرا قانون عملی زندگی سے خارج کیسے جانے پر فطری نشوونما سے محروم ہو جاتا ہے۔ لیکن آج بھی اس کے سرچشموں کی روانی اس کے اصولوں کی مضبوطی اور اس کی صلاحیت نشوونما میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا۔ آج جو لوگ اسے روایاتی ڈھکوسلا اور ملاتی سازش کی پھبتیوں کا نشانہ بنا رہے ہیں، وہ صرف اس بات کا ثبوت ہم پہنچاتے ہیں کہ انہوں نے اس نظام فقہ و قانون کا مطالعہ کئے

اس کی پائیداری اور عظمت، اس کی معقولیت اور اس کی وسعت و جامعیت کو نہیں جانا۔

اس کے قانون کا بنیادی ڈھانچہ جن اجزا سے بنتا ہے وہ یہ ہیں۔

(۱) نصوص، یعنی :-

۱ :- قرآن کے صریح احکام، ہدایات اور منہیات، مطلوبات اور ممنوعات

ب۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل سے ہر اثنہ ثابت ہونے والے احکام و منہیات

یہ وہ بنیادیں ہیں جن کو جوں کا توں پورے جذبہ تسلیم و رضا کے ساتھ قبول کر لینا اسلامی قانون کو

معلوم کرنے، یا اس کی تعبیر کرنے، یا اس کے عملی حالات پر منطبق کرنے، یا اجتہادی رائے قائم کرنے

ہی کے لیے نہیں، عین مسلم ہونے کے لیے شرط اول ہے۔ چنانچہ ہم سے نظام فقہ و قانون میں

نصوص کے صریح اوامر و نواہی کو جوں کا توں قبول کر کے ساری اٹھان انہی کے اوپر اٹھائی گئی ہے۔

(۲) اجماع، یعنی :-

نصوص کے صریح احکام کے اشارات اور دلالت سے جو اصول، مقاصد، مستلزمات، حکم و

مصالح، لازمی نتائج کے طور پر سامنے آنے والے اہم قانونی نکات اور اجتہادات و استنباط کے کلیات

اخذ ہوں، ان میں سے جس جس چیز کے ایک مرتبہ اسلامی شوریٰ اور اسلامی عدالتوں کے اختیار

کر لینے کے بعد کامل اتفاق سے مستقلاً قبول کر لیا گیا ہو اور بعد کے ارباب حل و عقد، مجالس شوریٰ

اور اسلامی عدلیہ (JUDICIARY) کے اداہوں، نیز ماہرین قانونیات (JURISTS) نے

جس کی پاسداری کی ہو، وہ اجماعی اصول یا فارمولائین جاتی ہے۔ چنانچہ ہمارے ہر قانون کچھ کلیات

میں واضح ہے کہ اجماع سے نہیں کہتے کہ چند مولوی یا مفتی کسی فتوے پر مل کر دستخط کریں۔ بلکہ اصلاً اجماع کی

اصطلاح ایک سیاسی اور قانونی اصطلاح ہے۔ بعد میں اس کا ایک ضمنی استعمال یہ بھی رائج ہوا ہے کہ علمی دائرے میں

تمام ماہرین و مفکرین اپنے اختلاف کو جن متفقہ اصول و کلیات سے محدود رکھتے ہیں ان کے لیے اجماع کی اصطلاح

برتی جاتی ہے۔ اجماع ہر نظام قانون کا ایک اہم عامل ہے۔ اس کی حقیقت کو سمجھنے میں ایک تازہ ترین مثال

ٹری مدوے سکتی ہے۔ پنجاب ہائی کورٹ نے مولانا عبدالستار خاں نیازی کی اپیل کو خارج کرتے ہوئے راجی کی بجائے

اور فارمولوں پر قائم ہوتا ہے اور اس کے اندر واقع ہونے والے اختلافات کو یہ کلیات اور فارمولے ایسی حدود میں محدود رکھنے کا پارٹ ادا کرتے ہیں جن کے ذریعے اس نظام قانون میں استقلال (STABILITY) پیدا ہو ہے۔ ورنہ اگر مجالس شوریٰ یا اسمبلیاں اپنے ہر اجلاس میں، اور عدالتیں اپنی ہر کارروائی میں بار بار کلیات اور فارمولوں کو توڑتی رہیں اور نئے نئے کلیات اور فارمولے وضع کرتی رہیں تو قانون کا کوئی مستقل ڈھانچہ بن ہی نہیں پاتا پھر وہ ریت کا ایک گھر ندان کے رہ جاتا ہے۔

کلیات اور فارمولوں کو جب ایک مرتبہ اختیار کیا جاتا ہے تو پھر وہ قانون کے پورے نظام پر اثر انداز ہوتے ہیں اور ان کو کوئی بھی رائے قائم کرنے، فیصلہ دینے، اجتہاد کرنے یا کسی مقدمے میں کوئی نظیر قائم کرنے کے عمل میں پوری طرح پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ پھر یہ بھی ہوتا ہے کہ کلیات اور فارمولے کہیں نہ کہیں تفصیل میں جا کر جب باہم دگر متاثر ہوتے ہیں تو کچھ نہ کچھ پیچیدگیاں برکھتی ہیں اور ہر فارمولے کو پیش آتی ہیں لیکن دنیا کے کسی بھی نظام میں یہ حماقت نہیں کی جاتی کہ جہاں کسی کلیتے یا فارمولے کی توجہ سے کوئی پیچیدگی سامنے آئی تو اسے چھوڑ کر جھبٹ ایک نیا متضاد کلیہ یا فارمولہ لاکھڑا کیا۔ بلکہ کلیات اور فارمولوں کے بنیادی ڈھانچے کو برقرار رکھ کر اسی کے اندر رہتے ہوئے پیچیدگیوں کا حل تلاش کیا جاتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح اجماع کا انسٹیٹیوشن اسلامی نظام قانون کو ایک مستقل ڈھانچہ فراہم کرنے کے لیے نصوص ہی سے اخذ کردہ متفق علیہ کلیات اور فارمولے سامنے لاتا ہے۔ ان کلیات اور فارمولوں کے باہمی تعامل سے تفصیل میں کہیں نہ کہیں پیچیدگیاں بھی نمودار ہوتی ہیں لیکن ان پیچیدگیوں

(بقیہ) لاہور کے مارشل لاء کے باوجود جو بیمار کس ڈیٹے تھے ان کا خلاصہ یہ تھا کہ یہ مارشل لاء عام عدالتوں کے متوازی اپنی عدالتیں جگا کر انسدادی منراوں کے ساتھ تعزیری نرا میں نافذ کرنے اور قیام امن کے لیے ضرورت کے حد سے آگے جا کر مختلف کارروائیاں کرنے کے وجہ سے اینگلو سیکسٹم آف لاء کے لیے بالکل اضمی بی ہے یعنی اینگلو سیکسٹم آف لاء جن کلیات اور فارمولوں پر قائم ہے اور جن کے خلاف نہ کسی پارلیمنٹ نے کسی کوئی قانون سازی کی ہے نہ عدالتوں نے کسی فیصلہ سے کہ کوئی نئی نظیر قائم کی ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں اینگلو سیکسٹم آف لاء کا جز، چیزوں پر اجماع ہے۔۔۔ مارشل لاء ان کے مطابق نہیں ہے اس مثال سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ "اجماع" ہر نظام قانون کا ایسا اہم اصول ہوتا ہے۔

کی وجہ سے نہ اس قانون کو ملائی ڈھکوسلا اور سازش کی پھبتیوں کا نشانہ بنا نا کوئی معقول حرکت ہو سکتی ہے، اور نہ ان جزئی چیزوں کی خاطر قانون کے مجموعی ڈھانچے کو توڑ پھوڑ کر نت نیا ڈھانچہ بنانے میں لگ جانا اجتہاد کے حق کو استعمال کرنے کی کوئی صحیح صورت ہے۔ ان جزئی پیچیدگیوں کو بہر حال اسلامی نظام فقہ و قانون کے مجموعی فریم میں رکھ کر اجماعی کلیات اور فارمولوں کے تحت ہی حل کیا جا سکتا ہے۔

اب اگر کچھ لوگ سرے سے اجماع کے انسٹی ٹیوشن ہی کو نہ مانیں، یا جن کے نزدیک سنت رسول ماخذ قانون ہی نہ ہو، ان کے لیے تو ہمارے نظام فقہ و قانون سے دلچسپی کی کوئی وجہ ہی نہیں اور نہ ان سے بحث کی کوئی بنیاد باقی رہ جاتی ہے۔ ان کو حق پہنچتا ہے کہ وہ نئے کلیات اور فارمولے بنا کر پورا ڈھانچہ ہی از سر نو مرتب کریں، لیکن جو لوگ سنت رسول کو نص ہی کا درجہ بھی دیں، اجماع کے انسٹی ٹیوشن کو بھی واجب الاحترام سمجھیں، نیز قانون کے مجموعی ڈھانچے کو برقرار رکھتے ہوئے کسی مسئلے کو حل کرنا چاہیں ان کے لیے لازم ٹھہرتا ہے کہ وہ :-

ا۔ کسی معاملے پر بحث چھیڑیں تو نصوص اور ان کے اشاراتی اور دلائلی تقاضوں کو جانیں،
ب۔ جو کلیات اور فارمولے اجماع کا درجہ رکھتے ہوں ان کے دور رس اثرات کا فہم پیدا کریں اور ان کی حدود میں رہ کر سوچ بچار کریں،

ج۔ کسی بھی شے سے تعلق رکھنے والے قانون کے مجموعی ڈھانچے کی ترتیب کو سمجھیں،
د۔ اور اگر خود قانون کی فنی بحثوں کے لیے تفصیلی علم نہ رکھتے ہوں تو یا تو علم حاصل کرنے پر متوجہ ہوں، یا پھر واقعی علم رکھنے والوں سے استفادہ کریں۔

یہ معاملات بہر حال سطحی مبدائی ہنگاموں اور عامیاناہ اخباری پریکٹس کا تختہ متشخص بننے کے لیے موزوں نہیں ہیں۔

اصل مسئلہ فقہ اسلامی کے فریم میں

ہمارا قانون میراث کسی بھی نظام قانون میں اگر آپ کیڑے نکالنے پر تامل جائیں تو یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ تفصیلات کے میدان میں بہت سی چیزوں کو آپ نامعقول کہہ سکتے ہیں، بہت سے احکام اور فیصلوں کا مذاق اڑا سکتے ہیں، اور ایسی چند چیزوں کے ہاتھ لگ جانے پر، آپ کو اس سے بھی کوئی نہیں روک سکتا

کہ اُس نظام قانون کے سائے دفترِ علم و تحقیق کو بے معنی قرار دے کر پورے پھینک دیں۔ لیکن اگر آپ سنجیدگی اور انصاف سے کام لے کر دیکھیں تو آپ کو اندازہ ہو گا کہ قرآن کی چند آیات اور رسول اللہ صلعم کی چند احادیث کو بنیادی سرچشمہ ہدایت مان کر، اُن سے احکام، اصول اور بنیادی مصلحتیں اخذ کرنے میں اسلامی قانون میراث کے مرتب کرنے والوں نے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ رشتوں اور تعلقات میں سے ایک ایک کی درجہ بندی کر کے اُن کی صفیں بنادی ہیں، تمام ممکن وراثا کی فہرست اوقیت (SENIORITY) اور اخردیت (JUNIORITY) کے لحاظ سے پورے استدلال کے ساتھ مرتب کر دی ہے، اصطلاحات متصرر کی ہیں، میراث کی خاص ریاضی مدون کر دی ہے۔ چنانچہ ہمارے ماہرین قانون نے ایک اسی قانون کے دائرے میں اتنا وسیع اتر پچھڑا ہے اور مطالعہ و تحقیق کے لیے اتنا مواد بعد والوں کو بہم پہنچا دیا ہے کہ اس پر عرف اسپیشلائز کرنے والے علماء ہی حاوی ہو سکتے ہیں۔ ہمارا قانون میراث صحیح معنوں میں ایک سائنس ہے جو ٹھیکہ سائنٹفک انداز سے پروان چڑھی ہے۔ اس سائنس کا جب بھی مطالعہ کیا جائے، یا اس کے مسائل میں جب بھی اظہار رائے کیا جائے تو سنجیدہ اور سائنٹفک انداز (APPROACH) اختیار کرنا چاہیے۔

ہمارے قانون میراث کے چندا جماعی فارمولے اور کلیات جس طرح ہم نے اوپر تفصیل سے بیان کیا تھا، ہمارے قانون میراث کا ڈھانچہ بنانے میں چند فارمولوں اور کلیات کو استعمال کیا گیا ہے۔ ان فارمولوں اور کلیات پر از اول تا آخر مجالس شوریٰ اور عدالتوں اور علمائے قانون کا اتفاق رہا ہے اور ان کو ہمیشہ ہمارے نظام فقہ و قانون میں ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اسی وجہ سے ہم کہیں گے کہ ان پر اجماع ہے۔ یہاں ہم بحث سے تعلق رکھنے والے چند کلیات کو پیش کرتے ہیں:-

پہلا کلیہ | سورہ نساء کے رکوع اول میں "عانتك الوالدان والاقربون" کا دوبار آیا ہوا ٹکڑا، نیز دوسری تمام متعلقہ آیات میں قرابت کے رشتوں، بنا پر حق وراثت کا تعین صاف بتاتا ہے کہ یہ حق جس بنیاد پر قائم ہوتا ہے وہ "قرابت" ہے۔

دوسرا کلیہ | قرابت کو میراث پانے کے حق کی بنیاد مانتے ہی یہ سوال سامنے آجاتا ہے کہ آیا ایک مرتبت

کے ترک میں سے اس کے تمام کے تمام قرابت وار بہ یک دم حقد پائیں گے یا بعض کے بہتے ہوئے بعض محرم رہیں گے، نیز کیا سب کا حصہ مساویانہ ہوگا؟ صریح نصوص سوال کے ان دونوں اجزا کا جواب نفی میں دیتی ہیں۔ نصوص ہی کی رہنمائی سے ہمارے ماہرین قانون و JURISTS نے سب ذیل دو باتیں علم میراث کے اساسیات (FUNDAMENTALS) کے طور پر طے کر کے ان پر اجماع کر لیا ہے کہ :-

۱۔ کسی میت کے تمام کے تمام اقربا یا ممکن وراثا بہ یک دم میراث نہیں پاسکتے، بلکہ درجہ قرابت میں جو مقدم ہیں، وہ تو خیرین کو کھلا یا جزاً محروم کرتے ہیں یعنی جس متعین حصے یا کل ترکے کو پلنے کے لیے زیادہ قریبی وارث موجود ہوں گے، وہ دور والوں تک نہیں پہنچے گا۔

ب۔ کسی میت کے قانوناً وارث قرار پلنے والے اقربا اگر درجہ قرابت کے لحاظ سے یکساں نہ ہوں تو ان کا حصہ مساویانہ نہیں ہو سکتا بلکہ تعلق کے قرب و بعد کے لحاظ سے کم و بیش ہوگا۔

قرابت کے فرق مراتب کو سب سے پہلے سورہ نساء کی آیت مذکورہ بالا کا لفظ "مما ترک الوالدان والاقربون" واضح کرتا ہے۔ ان الفاظ کے ذریعے شائع نے رہنمائی دے دی کہ قرابت داری کے دو سر تمام مدارج پر نبوت یعنی اپنے والدین سے وراثت پلنے کا حق قائم کونے والے تعلق کو فوتیت حاصل ہے، اسی سے اقرباء کی عام تنفی میں سے والدین کو الگ کر کے اولین مرتبہ دیا گیا ہے۔ پھر واولوا ذلک جہام بعضہ اولی ببعض فی کتاب اللہ" میں صراحت کر دی گئی کہ تعلقات رحمی کے مدارج مختلف ہیں۔ اسی حقیقت سے "الاقرب فالاقرب" کا اصول ماخوذ ہے۔ اور اس اصول پر تقطعی اجماع ہے۔ مدارج قرابت | قرابت کے لیے فرق مراتب کو تسلیم کر لینے کے بعد لازم ٹھہرا کہ قانون میں اس فرق کو تفصیل سے واضح کیا جائے۔ چنانچہ ماہرین نے خود نصوص ہی سے روشنی حاصل کیے بڑے سائنٹفک طریق سے اقرباء کے مدارج مقرر کیے ہیں۔ بنیادی طور پر ان کو تین صنفوں میں تقسیم کیا گیا ہے :-

پہلی صنف وارث بننے والے ان اقرباء کی ہے جن کو ذوی القربى کہتے ہیں۔ یہ وہ اقرباء ہیں جن کے حصے قرآن میں متعین طور پر بیان کر دیئے گئے ہیں۔ قاعدہ یہ ہے کہ سب سے پہلے ان لوگوں کے متعین حصے الگ کر دیئے جاتے ہیں، بقیہ حقوق با حجاب بعد میں ہوتا ہے۔

دوسری صف وارث بننے والے اُن اقربا کی ہے جن کو عصبیات (RESIDUARIES) کہتے ہیں۔ یہ لوگ یا تو ذوی الفروض کے متعین حصے ادا ہونے کے بعد بقیہ ترکہ بیٹے ہیں، یا اُن کی عدم موجودگی میں کل ترکہ پاتے ہیں۔

عصبیت کے حق کے لیے استدلال کا سرچشمہ ذیل کی نصوص ہیں:-

(۱) سورہ نساء کے رکوع ۲ کی آیت یوسیکھا اللہ فی اولادکم... الخ میں یہ ٹکڑا کہ "فان لکم

لیکن لہ ولد وورثہ ابواک اطلاقاً" باپ کو جس بنیا پر وارث بنا تا ہے اسی کے لیے عصبیت کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ بخلاف اس کے میت کی ماں صاحبہ فرض ہوئی، کیونکہ اس کے لیے متعین کر دیا۔

(۲) ابن عباسؓ کی روایت "الحقوا الفرائض ماہلہا فسا بقی نہوا لاولیٰ رجل ذکرتہ میں قریب ترین درجہ قرابت کے مرد کو جو استحقاق خصوصی دیا گیا ہے، وہ عصبیت کا استحقاق ہے یعنی ذوی الفروض کے متعین حصے ادا کرنے کے بعد عصبہ کو وراثت ملے گی۔

(۳) حضرت عمرؓ کی روایت کہ آپ نے نبی صلعم کا یہ ارشاد سنا کہ "ما احوز الوالد والولد نہوا لعصبیتہ من کان" (یعنی جو کچھ مال باپ یا بیٹے کا جمع کردہ ہو تو وہ اس کے عصبہ کا ہے، جو بھی ہو) عصبیات کی ایک مستقل حیثیت متعین کرتی ہے۔

(۴) روایت بخاری "واجعلوا الاخوات مع البنات عصبۃ" (یعنی جب محض لڑکیاں وارث ہوں، لڑکا کوئی نہ ہو تو بہنوں کو ان کے ساتھ عصبہ قرار دو) بھی مرتبہ عصبیت کے لیے ایک واضح دلیل اور سند ہے۔

تیسری صف وارث بننے والے اُن اقربا کی ہے جن کو اولوالارحام (DISTANT KINDREDS) کہتے ہیں۔ یہ وہ رشتہ دار ہیں جو نہ تو ذوی الفروض میں ہوں، نہ عصبیات کے مقام پر بلکہ جن کا تعلق قرابت کسی عورت کے واسطے سے میت کے ساتھ قائم ہوتا ہو۔ یہ ذوی الفروض اور عصبیات کی دونوں صفوں کی عدم موجودگی میں ترکہ پاتے ہیں۔ ان کا استحقاق ذیل کی نصوص سے ثابت ہے:-

(۱) "لہرجال نصیب مما ترک الوالدان والاقربون والنساء نصیب" الخ

(ترجمہ)۔ مردوں کا حصہ ہے اس مال میں جو باقی چھوڑیں ان کے والدین اور اقرباء اور عورتوں کا حصہ ہے اس مال میں جو باقی چھوڑیں ان کے والدین اور اقرباء) میں یہ حقیقت کہ لفظ "اقربون" قرابت کے سلسلے مراتب پر حاوی ہے، نیز "للمنساء" کی یہ توجیح کہ عورتیں بھی سلسلہ وراثت میں داخل ہیں، اور اولاد عام کی صنف کو ایک مقام دیتی ہے۔

(۲) سورہ انفال کی آیت "و اولوالاؤحام بعضہم علی بعض نی کتبہ اللہ" (ترجمہ: قرابت رحمی رکھنے والے رشتہ دار خدا کے قانون کے تحت ایک دوسرے پر فوقیت رکھتے ہیں) کے الفاظ مزید صراحت کر رہے ہیں۔

(۳) نبی صلعم کا یہ ارشاد کہ "الخال وارث من لا وارث لہ"۔ بخاری (ماموں اس کا وارث ہے جس کا کوئی اور وارث نہ ہو) قطعی طور پر دال ہے کہ ذوی الفروض اور عصباء کی عدم موجودگی میں اولوالاؤحام حسب مراتب وارث ہونگے۔

تقسیم و تقسیم | چونکہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک ہی وارث ایک طرف سے ذوی الفروض میں داخل ہے دوسری طرف سے عصباء میں، اور ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا مقام بہ یک وقت عصباء میں بھی ہو اور اولوالاؤحام میں بھی، نیز چونکہ خود ذوی الفروض، عصباء اور اولوالاؤحام کی صفوں میں داخلی طور پر تقدم و تاخر پایا جا سکتا ہے، اس لیے تین صفوں کو پھر تین درجہات (GRADES) میں تقسیم کر کے کل ۹ گروپ بنا دیئے گئے ہیں۔ تفصیل یہ ہے :-

طبقات	انقسام و درجہات	ذوی الفروض	عصباء	اولوالاؤحام
طبقة اول (یعنی میت کے فروع)	خاندنہ۔ بیوی بیٹی۔ پوتی وغیرہ	بیٹا۔ پوتا۔ پوتو پوتا وغیرہ	بیٹی کی اولاد۔ پوتی کی اولاد وغیرہ	
طبقة دوم (یعنی میت کے اصول)	ماں باپ۔ دادا۔ دادی۔ نانی وغیرہ	باپ۔ زادا۔ پروردار وغیرہ	نانا۔ نانی کا باپ۔ تانا کا باپ وغیرہ	
طبقة سوم (یعنی میت کے فروع کے فروع)	بہن حقیقی بہن علاتی بہن اخیانی	بھائی حقیقی بھائی علاتی اکل اولاد وغیرہ	بھائی بہنوں کی اولاد۔ رسول کے بھائی اور علاتی بھائیوں کی اولاد وغیرہ	

پھر ان طبقات اور صفوں کے ہر گروپ کے اندر ایک ایک رشتہ دار کے تقدم و تاخر کو مقرر کیا گیا ہے

اور اس تحقیقی کام کی تکمیل کے لیے نصوص کے ان اشارات سے بھی مدد لی گئی ہے جو نکاح و طلاق، رضاعت، ولایت، وکالت، وغیرہ کے سلسلے میں رشتوں کی درجہ بندی کرنے میں کچھ بھی مدد دیتے ہیں۔

ان گروہوں میں سے اگر کسی سے کوئی رشتہ دار موجود نہ ہو تو پھر خند شاذ صورتیں غیر رشتہ دار لوگوں کے وراثت پانے کی ہیں، وہ بھی نہ ہوں تو آخری صورت میں پوری مسلم سومانٹی (اسلامی بیت المال) وارث ہے۔ یہ تفصیل اس لیے دی گئی ہے کہ یہ حقیقت سمجھی جاسکے کہ قانون میراث ایک وسیع مرتبہ ڈھانچہ (STRUCTURE) رکھتا ہے، اور کوئی نئی چیز اس صورت میں اختیار کی جاسکتی ہے جبکہ وہ اس ڈھانچے میں اپنی جگہ بنا سکتی ہو۔ وہ چیزیں جو ضروری تبدیلی کے بجائے پر سے ڈھانچے کو توڑ کر داخل کی جاسکتی ہوں، ان کے لیے اس ڈھانچے میں جگہ نہیں ہے۔

تیسرا کلیہ | اوپر کی تقسیم مراتب کتاب و سنت سے کہ جن صریح احکام یا اشارات و دلائل پر مبنی ہے ان کی نوسے سے لازم آتا ہے کہ اگر ایک ہی طبقے، ایک ہی صف یا ایک ہی گروہ کے چند ایسے ممکن عاثر موجود ہوں جن میں سے کچھ مقدم ہوں، کچھ موخر، تو مقدمین سائرانہ کہ (یا اس کا وہ خاص حصہ جس کا معاملہ زیر غور ہو) لے جائیں گے اور موخرین وارث نہیں ہوں گے۔ اس اصول کو "الاقرب فالاقرب" (پہلے قریب کے، پھر دور کے) کے الفاظ میں سٹے کیا گیا ہے۔ اور اس پر قطعی اجماع ہے۔

اس اصول کے تحت قاعدہ یہ ہے کہ جس شخص کا رشتہ میت سے کسی دوسرے شخص کے واسطے سے ہو تو شخص متوسط مقدم ہوگا اور مذکورہ شخص کو موخر کر دے گا۔ چنانچہ یہی کلیہ ہے جو آگے چل کر کلیہ "تھیب" (یعنی کسی ممکن وارث کے ترکہ پانے میں اس سے قریب درجے کے وارث کا جزؤ یا کلاً حائل ہو جانا) کی بنیاد بنتا ہے۔

چوتھا کلیہ | چونکہ ابن عباس کی روایت "الحقوا الفقراء الض باہلما فمافقی فهو لادنی رجل ذکیر" (یعنی سب سے پہلے نصوص کے مقبرہ کو دہ جتے، ان کے مقبروں کو ادا کرو، پھر جو باقی بچے وہ سب زیادہ قریبی مرد کا حق ہے) درجہ اول کے قریب ترین مرد کو مرتبہ خصوصیت دیتی ہے، لہذا کلیہ یہ ہے کہ جب لے جب کوئی مرد عصرت کا مرتبہ پاتا ہے تو اس کی بہن بنتا اس رتبے میں اس کی شریک بنتی ہے، (باقی صفحہ ۲۱۷ پر)

مک درجہ اول کا کوئی فرد بھی عصوبت کا مقام لینے کو موجود ہو، اس مقام کو اس سے بعد کے درجے کا کوئی وارث نہیں لے سکتا۔ مرتبہ عصوبت میں بلا واسطہ اقربا اور بالواسطہ اقربا کبھی جمع نہیں ہو سکتے۔ نہ صرف یہ کہ اس معاملے میں حدیث بالکل قطعی اور متفق علیہ ہے، بلکہ قرآن کی آیات میں بھی اس کے خلاف دلیل بننے والی کوئی جزئی سے جزئی صورت اخذ نہیں کی جاسکتی۔ پس یہ کلیہ ایسے کلیوں میں سے ہے جن کا ترک خود شریعت اسلامیہ کو، قرآن و سنت کو الوداع کہنے کے ہم معنی ہے۔ واضح رہے کہ یہ کلیہ جو اوپر کے کلیوں کا فطری تقاضا بھی ہے چچاؤں کی زندگی میں میٹھ پوتوں کے وارث ہونے میں مانع ہے۔

پانچواں کلیہ | پانچواں کلیہ جو ریشے نصوص صد فی صد قطعی ہے، یہ ہے کہ کوئی شخص کسی شخص کی زندگی میں اس کا وارث نہیں ہو سکتا۔ وارث کوئی بتنا ہی اس وقت ہے جب کوئی شخص موت کی مرحلہ سے گذر جائے اور مال چھوڑے۔

نصوص قرآنی میں جہاں قانون وراثت بیان ہوتا ہے وہاں ہر ہر ٹکڑے میں مما ترک، مما ترک، مما ترک، مما ترک، کے الفاظ بار بار وارد ہیں۔ یعنی قانون وراثت کی بحث کا موضوع ہی ترک ہے۔ نہ کوئی مال کسی شخص کی زندگی میں ترک ہو سکتا ہے، نہ اس مال میں یہ حیثیت وارث کسی کا حق پیدا ہوتا ہے۔

پھر ملاحظہ ہو سورہ نساء رکوع ۲۴ کی آیت یستفتونک... الخ میں آتا ہے ان اضراء ہذا لیس لہ ولد ولا اخت... (اگر کوئی شخص مر گیا، اور اس کی کوئی اولاد نہیں ہے بلکہ اس کی بہن موجود ہے تو...) یہاں پوری وضاحت ہے اس بات کی کہ وراثت تلاش کرنے کا سوال، یا اقربا کے استحقاق وراثت کا سوال کسی شخص کے مرنے پر پیدا ہوتا ہے، زندگی میں نہیں۔ چنانچہ یہ اصول بھی قطعی اصول ہے کہ کسی کی زندگی میں کوئی دوسرا اس کا وارث قرار نہیں پاسکتا

رقیہ حاشیہ ص ۳۱۶) یہ قاعدہ قرآن کے صریح منصوص احکام پر مبنی ہے۔ میت کی اولاد نہ دیکھنے کی صورت میں اس کی بیٹیوں کے ساتھ بہن کا عصبہ ہونا ایک استثنائی صورت ہے جو حدیث پر مبنی ہے۔

بلکہ اس کے مرنے کے بعد وراثت کا حق پیدا ہوتا ہے۔

واضح ہے کہ یہ متفق علیہ اور قطعی اصول بھی یم پنے کے مسئلے پر پوری طرح اثر انداز ہوتا ہے۔

اس کا باپ اپنے باپ کی زندگی میں وراثت نہیں تھا، لہذا اس کا کوئی حق ثابت نہیں۔

چھٹا کلیہ | اوپر کے کلیے کے منطقی نتیجے کے طور پر دوسرا کلیہ یہ بنتا ہے کہ کسی بھی مرنے والے کے ترکہ میں حق وراثت صرف زندہ وارثوں کا ہوتا ہے، مرنے والے ممکن وراثت کو مرنے سے محسوب ہی نہیں کیا جاتا۔

یہ کلیہ بھی نصوص قرآنی کی قطعی دلالت پر مبنی ہے۔ آپ خود غور کیجیے کہ قانون میراث کو بیان کرنے

والی آیات (نیز احادیث) میں جہاں یہ الفاظ آتے ہیں کہ للرجال نصیبہ، تو ان موقعوں پر کیا مردوں

اور عورتوں سے مراد زندہ مرد اور زندہ عورتیں ہیں یا زندہ کے ساتھ مردہ بھی؟ اسی طرح "یوصیکم اللہ فی

اولادکم" میں بات زندہ اولاد کی ہے یا زندہ و مردہ دونوں کی؟ پھر اسی طرح "فان کن نسائہ فوق اثنتین"

میں بیان زندہ عورتوں کا ہے یا زندہ و مردہ دونوں کا؟ اسی طرح "وان کانت واحدة" ان کا ن لہ

ولد، "فان لکم یکن لہ ولد"، "فان کان لہ اخوة"، "ان لکم یکن لکم ولداہ"

"فان کان لکم ولد"، "ولدہ اخ و اخت"، "فان کانوا اکثر من ذالک"، "لیس لہ ولد و لہ اخت"

ان لکم یکن لکم ولد"، "فان کانوا اثنتین"، "وان کانوا اخوة رجالا و نسائہ" کے تمام ٹکڑوں

کو سامنے رکھئے اور فیصلہ کیجیے کہ اگر فلاں رشتہ دار ہو سے کیا یہ مدعا نکالا جا سکتا ہے کہ کبھی پہلے موجود

رہا ہو، یا فلاں رشتہ دار نہ ہو سے یہ مفہوم بھی پیدا کیا جا سکتا ہے کہ اس قسم کا رشتہ دار مرنے سے پہلے

ہی نہ ہوا ہو اور کبھی پہلے بھی وجود نہ رکھتا ہو؟ اگر کوئی شخص کہے کہ ہاں: یہ مفہوم بھی نکالا جا سکتا ہے تو

سب سے پہلے تو ہم اسے عربی زبان و ادب کا لحاظ کرتے ہوئے دلائل سے پھر اسے یہ بتائیں گے کہ

آج تک کوئی ایک فرد بھی فوراً مرنے سے لے کر ایسا پیدا نہیں ہوا جس نے اس انوکھے

اجنبائی مفہوم کی گنجائش کہیں سے ڈھونڈ نکالی ہو۔ لیکن اس پر بھی اگر نشہ اجتہاد نہ آئے تو ہم ذیل

لہ برطانوی قانون وراثت میں بھی یہ اصول اسی طرح زیر عمل ہے

کی نصوص سامنے رکھ کر پڑھیں گے کہ لہن پر کس طرح آپ کا مفہوم منطبق ہو سکے گا۔

(۱) وَإِنْ كَانَ رَجُلٌ يُؤْمِنُ أَنْ أَصْحَابَتَهُ أَوَّامًا وَلَهُ إِخٌ أَوْ أُخْتٌ (ترجمہ: اگر کوئی مرد یا عورت اس حالت میں ترکہ چھوٹے کہ وہ کلالہ ہو یعنی نہ اس کا باپ زندہ ہو نہ بیٹا بلکہ اس کے بھائی یا بہن ہوں تو) میں کیا یہ تصور کیا جاسکتا ہے کہ مرے سے کوئی شخص عیسیٰ علیہ السلام کی طرح بے باپ کے پیدا ہوا ہو گا۔ ظاہر ہے کہ باپ تھا اور مر گیا، لہذا اس کے وارث ہونے کا سوال خارج از بحث ہو گیا۔

(۲) وَإِنْ لَمْ يَكُنْ لَهُ وَلَدٌ وَوَرِثَةُ الْبَوَاءِ فَلَأَمَةٌ اثَلْتِ (یعنی اگر اس کے اولاد نہ ہو اور اس کے وارث اس کے والدین ہوں تو اس کی ماں کا حصہ) ہو گا، میں کیا والدین مردہ ہونے کی صورت میں بھی وارث ہونگے؟ اور ۱/۲ حصہ اس کی ماں کا شمار کیا جائے گا؟

(۳) حدیث: الخال وارث من لا وارث له (ماموں وارث ہیں اس کا جس کا کوئی وارث نہ ہو) میں کیا من لا وارث له سے مراد یہ ہے کہ جس کا کوئی زندہ یا مردہ وارث موجود نہ ہو اس کا وارث ماموں ہو گا یا بات صرف زندہ وارث تک محدود ہے اور زندہ آپہ کی نہ ہونے کی وجہ ماموں کی حق میں پہلے نیز کیا خود خال سے مراد ایسا حال بھی لیا جاسکتا ہے جو میت کی وفات سے پہلے مر گیا ہو؟

(۴) حدیث: - بروایت ابن بربیدہ، عن ابیہ، ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم جعل للجدۃ السدس اذا لم یکن دونہا ام (یعنی نبی صلعم نے داری کے لیے چھٹا حصہ مقرر کیا ہے جبکہ اس کے ساتھ ماں موجود نہ ہو) میں کیا اذا لم یکن دونہا ام سے مراد یہ لیا جاسکتا ہے کہ میت کی مرے سے ماں ہے ہی نہیں، یا عاتق صاف مطلب یہ لیا جائے گا کہ ماں تو ہوتی ہی چاہیے لیکن اس سے پہلے چکی ہو پس اس معاملے میں پوری امت متفق ہے کہ وراثت کے حق کی بحث کا تعلق صرف ان زندہ وراثت سے ہے جو کسی صورت کے مرنے پر موجود ہوں۔ پیسے کے مرے ہوؤں کا کسی طرح کا استحقاق مرے سے شریعت اسلامی کے نظام قانون میں نہیں پایا جاتا۔ اس طرح کے غیر عقلی استحقاق کی مثال اگر ہے تو ہندوانہ رواجی قانون میں ہے۔ اب اگر کسی کو یہ ہندوانہ رواجی قانون پسند ہو تو مرے سے شریعت کو چھوڑ کر اسے اختیار کر سکتا ہے، لیکن اس ہندوانہ رواجی قانون کے اجزا کو لاکر شریعت کے قانون میں پوند نہیں دینا ماضی رہے کہ یہ کلیہ بھی تہیم پختے کے زیر بحث مسئلے پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اسے توڑنے بغیر

لہ یہ صورت فریسی قانون میں بھی پائی جاتی ہے۔

ہم کسی طرح اُسے وارث نہیں بنا سکتے :-

صورتِ مسئلہ | جن کلیوں کو ہم نے ایک ترتیب کے ساتھ مختصر سا استدلال کر کے پیش کیا ہے وہ جیسے کتاب و سنت کے نصوص پر مبنی ہیں۔ ان کلیوں ہی کا عمل ہے جو تقسیم پوتے کو زندہ چھاؤں کے ساتھ حق وراثت دلوانے میں مانع ہے۔ فرض کیجیے کہ زید کے تین بیٹے اسلم، اکرم، اور اکبر تھے۔ اسلم زید کی

زندگی میں اس کے ترکے

کی تقسیم سے قبل فوت

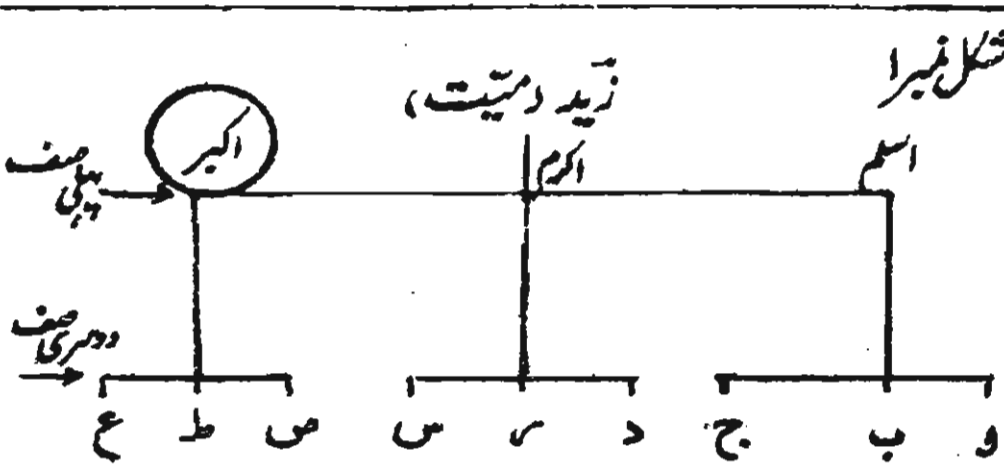
ہو گیا۔ اب زید کے دو بیٹے

اسلم اور اکرم موجود ہیں،

اصان کے ساتھ اسلم کے

بیٹے و، ب، ج، اکرم کے

بیٹے د، س، اس اور اکبر



کے بیٹے و، ب، ج، اکرم کے بیٹے د، س، اس اور اکبر کے بیٹے ع، ط، ص بھی ہمارے سامنے ہیں۔

زید کی موت پر جب ہم مستحقین میراث کی تلاش میں نکلتے ہیں تو آگے پیچھے دو صفیں ہمارے سامنے آتی ہیں پہلی صف زید کے بیٹوں اسلم اور اکرم کی ہے، اور دوسری صف زید کے پوتوں د، ب، ج، د، س، اس، ع کی ہے۔ ہمارے قانون میراث کے ثابت شدہ اور نہایت درجہ معقول کلیات اور تقاضیوں کا تقاضا یہ ہے کہ جب تک پہلی صف میں مرتبہ عصوبت (دادلی رجیل) ذکور رکھنے والا ایک وارث بھی موجود ہو، دوسری صف کا کوئی فرد ترکہ نہیں پاسکے گا۔ کیونکہ اسلم اور اکرم کا تعلق زید سے بلا واسطہ ہے، لیکن و، ط، ع کی صف دوم کے جملہ افراد کا تعلق بلا واسطہ ہے۔ آپ کا جذبہ رحم | لیکن آپ کے ذہن میں صرت پوتے کا تصور کارفرما نہیں، بلکہ منکرین حدیث نے اُس کے ساتھ اسم صفت "تیمم" لگا کر مسئلے کو بڑی جذباتی شکل دے دی ہے۔ کوئی نہیں سوچتا کہ اولیٰ تقسیم وراثت کے مجموعی واقعات میں پوتے کا ایسا مسئلہ کے فیصد صورتوں میں پیدا ہوتا ہوگا،

پھر کتنی صورتوں میں پوتا بالغ اور صاحب اولاد ہوگا اور اپنا کاروبار، اپنی املاک اور اپنے والد سے بلا ہوا ترکہ رکھتا ہوگا، اور یہ بھی کوئی نہیں سوچتا کہ کتنی صورتوں میں واد امرتے ہوئے جائداد کے بجائے ذمہ داریاں (LIABILITIES) چھوڑ کر رخصت ہوگا۔ لیکن موجودہ پروپنڈے کی جہم آپ کے ذہن میں انگوٹھا چوستا ہوا ایک نتھا سا یتیم لاکھڑا کرتی ہے، آپ کو اس پر رحم آتا ہے، آپ کے جذبات رقت اٹھتے ہیں، اور آپ سوچتے ہیں کہ خدا کا قانون کبھی ایسا بے ہر نہیں ہو سکتا کہ یتیموں کو یوں بے کسی کی حالت میں ڈال دے، جبکہ شریعت میں یتیموں کو سہارا بہم پہنچانے کے لیے خود خدا اور رسول نے جگہ جگہ تاکید کی ہے۔ یہاں تک کہ مسدس حالی کا ایک مشہور جذبہ وہ یتیموں میں رحمت لقب پانے والا آپ کی زبان پر آ جاتا ہے۔ پھر آپ کو خیال آتا ہے کہ ہونہ ہو خدا کے قانون کو سمجھنے میں غلطی کی گئی ہے، یا واقعی من گھڑت روایات کو قانون الہی کے ساتھ گڈ گڈ کر دیا گیا ہے جس کی وجہ سے ہمارے نظام فقہ و قانون میں ایسے ایسے مضحکہ انگیز مسائل پیدا ہوتے ہیں۔

مگر جب آپ ذمہ تامل سے کام لے کر سوچیں گے اور اَلْأَقْرَبُ فَالْأَقْرَبُ کے عین قرآنی اصول کا عمل، نیز حجب حرمان کا اثر مختلف صورتوں میں ملاحظہ فرمائیں گے تو رحم کے بے شمار مواقع سامنے آئیں گے۔ یہاں تک کہ اگر حدیث و سنت سے آپ قطعی انکار کر کے منکرین حدیث کا وہ خالص قرآنی نظام قانون بھی اپنائیں تو بھی اس طرح کی "قابل رحم" اور "مضحکہ انگیز" صورتوں سے نجات نہیں۔ مثلاً ایک شخص کے ممکن وراثہ میں اگر بیٹا — اور بیٹیا ہی نہیں، پوتا، پڑپوتا — موجود ہو تو اس کی سگی بہن اپنے قریبی تعلق کے باوجود محروم رہے گی، پھر اگر وہ بیوہ بھی ہو تو آپ کہیں گے کہ "آہ! بیوہ بہن محروم؟" — خدا کا قانون ایسا بے ہر نہیں ہو سکتا، درآ خالیکہ پوراؤں کو سہارا بہم پہنچانے کی تاکید کی گئی ہے۔ اسی طرح تو اسی جس کی والدہ اپنے والد کے ترکہ کی تقسیم سے قبل فوت ہو گئی ہو، بھی قابل رحم ہے۔ پھر یتیم بھانجروں بھانجریوں اور بھتیجیوں بھتیجیوں کی محرومی بھی جذبات ہمدردی میں حل پیدا کر سکتی ہے۔ نیز آپ یوں

لے علاوہ بریں نکاح و طلاق، رضاعت و کفالت اور مضاربت و مشارکت وغیرہ کے قوانین میں ربلکہ دنیا کے ہر قانونی نظام کے ہر شعبے میں بے شمار مواقع رحم پیدا ہو سکتے ہیں۔ اب اگر قانون کو جذبات کا کھلونا بنایا جائے لگے تو سوچئے کہ کوئی قانون بھی حل سکتا ہے؟

بھی سمجھ سکتے ہیں کہ جہاں کہیں کوئی یتیم یا یرمہ یا بے کس آپ کو نظر آئے، آپ تقاضا کریں کہ قانون شرعی میں اسے بھی کسی نہ کسی کا وارث بنا دیا جانا چاہیے۔

اب اگر آپ کے جذبہ رحم کی ہر لہر کو اس کا کھلا موقع دے دیا جائے کہ وہ کلیات اور فارمولوں اور نظام فقہ و قانون کے پورے ڈھانچے کو توڑتی پھوڑتی جدھر سے جدھر چاہے بڑھتی جائے تو خیال فرمائیے کہ ایک خبرنی پیمیدگی کو حل کرنے کے لیے آپ گل کو تباہ کر ڈالیں گے۔

اجماع [آپ کے جذبہ رحم کے تقاضے کے جواب میں علماء آپسے یہ کہتے ہیں کہ یتیم پوتے کو اس کے چچاؤں کی موجودگی میں نذرہ میں سے حصہ نہ دینے پر اجماع ہے۔ اس سے ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اسلامی قانون وراثت جن کلیات اور فارمولوں سے بنا یا گیا ہے اور جن کے قائم رہتے ہوئے یتیم پوتے کو حصہ دلوانے کا کوئی راستہ نہیں اور کلیات اور فارمولے ایسے ہیں کہ بالکل منفق علیہ ہیں اور انہی کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسلامی حکومتوں کے نظام عدلیہ نے ان اول تا آخر یتیم پوتے کو اس کے چچاؤں کے پہلو بہ پہلو کبھی وارث تسلیم نہیں کیا ہے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ یتیم پوتے کی وراثت کا یہ زیر بحث مسئلہ کسی خاص دور یا ملک کے حالات میں اپنی نوعیت تبدیل نہیں کرتا اور نہ حالات کے اختلاف سے متاثر ہوتا ہے، لہذا یہ کوئی اجتہاد کرنے کا میدان نہیں ہے کہ آپ یہ کہیں کہ پہلے ایک اجتہاد کیا گیا تھا جو نئے حالات میں اپنے اندر تبدیلی چاہتا ہے لہذا ہم از سر نو اجتہاد کرتے ہیں یہ مسئلہ قانون وراثت کے بیشتر مسائل کی طرح ایک ٹھوس اور مستقل مسئلہ ہے۔ اس لیے اس میں تبدیلی کرنے کے لیے علماء کے دعوے کو توڑنا صرف اس طرح ممکن ہے کہ آپ یہ ثابت کریں کہ اس مسئلے کو موجودہ شکل دینے والے کلیات اور فارمولے ہی غیر اسلامی یا نامستقل ہیں

۱۔ منکرین عدیث کی طرف سے یہ حملہ (ATTEMPT) کیا تو کیا ہے مگر اس حد تک نہیں کہ وہ مذکورہ بالا کلیات کا کامل رد کریں، ان کو تسلیم کرنے پر وہ بھی مجبور ہیں بس وہ چند تفصیلی جزئی مثالوں میں جا کر یہ دکھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ خود فقہانے ان میں سے ہر کلیہ کی خلاف ورزیوں کی ہیں اور ان خلاف ورزیوں کو بیان کرتے ہوئے وہ کبھی اشعار چسپاں کر کے اور کبھی طنز کر کے ان کا مضحکہ بھی اڑاتے ہیں۔ لیکن ایسے بائیک مواقع پر پوزیشن درحقیقت یہ ہوتی ہے کہ ایک مسئلہ میں بیک وقت دو یا تین کلیوں کا

یا ان کی بنیاد نصوص کے تقاضوں اور اشارات پر نہیں ہے یا ان پر درحقیقت اجماع ہی نہیں ہے بلکہ وہ اختلافی اور قابل بحث و نظر ہیں۔ یا دوسری صورت یہ ہے کہ نصوص، آنحضرت صلعم کے فیصلوں، اسلامی مباسس شوری اور اسلامی عدلیہ کے فیصلوں میں سے آپ کوئی نظیر ایسی ڈھونڈ کے لے آئیں جس سے یتیم پوتے کو اس کے چچاؤں کی موجودگی میں وراثت دلوانا ثابت ہو سکے۔ اس صورت میں اگر ہمارے قانون میراث کا ڈھانچہ شکست و ریخت سے دوچار ہوتا ہو تو یہ آپ کا کام ہے کہ اس ڈھانچے کو نئے کلیات اور ذاموں سے از سر نو ترتیب دیں۔ لیکن اس معقول اور سائنٹفک روش (APPROACH) کے بجائے اگر آپ صرف جذبہ رجم کا مظاہرہ کرتے پھریں اور لوگوں سے کہیں کہ "دیکھو جی یتیم پوتا محروم ہے، یہ ملاؤں کی سازش ہے، یہ روایات کا فتنہ ہے، کبھی پرکھیں ماری جا رہی ہے" تو ایسے مذاق اور ایسی شاعری سے قانون کے مسائل کو حل نہیں ہو سکتے۔

ایک چیز جسے رسول اللہ صلعم کے دور سے لے کر خلفائے راشدین، اور ابعد کے تمام ادوار میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۲۲)

عمل صحیح ہو جاتا ہے اور سوچنا یہ ہوتا ہے کہ مسئلہ پر کس کلیے کا عائد کرنا اہم تر ہے اور کس کو کم اہمیت کی وجہ سے چھوڑا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ایسے مواقع پر اختلاف بھی ناگزیر ہو جاتا ہے اور اس طرز کے پیچیدہ مسائل میں ہمارے مدارس فقہ کا پہلے سے اختلاف موجود ہے اور آئندہ بھی موجود رہے گا۔ مگر نہ پہلے تفصیل کے فنی اشکالات اور ان پر پیدا ہونے والے اختلاف کی وجہ سے کسی نے ان کلیات کی صحت و اہمیت سے انکار کیا ہے، نہ آج ایسا کرنا صحیح ہے۔ دنیا کے ہر نظام قانون میں، بلکہ ہر شعبہ زندگی کے علم و فنون میں کلیات کو باریک تفصیلی و جزئی امور میں منطبق کرتے ہوئے بھی صورت پیش آتی ہے۔ لیکن کبھی بھی اہل علم بنیادی مسلمات کو جزئی اشکالات کی بنا پر منعکس انگیز نہیں قرار دیتے۔ لیکن یہ ہمارے منکرین حدیث خوب لوگ ہیں یہ ہمارے علمائے قانون کی کتابوں میں سے چھانٹ چھانٹ کر وہ حصے نکال لاتے ہیں جن میں اعتراضات اور اشکالات زور بیان کے ساتھ سامنے لائے جاتے ہیں، لیکن ان کے ساتھ وہ اعتراضات کے جو جواب دیتے ہیں اور اشکالات کو جس طرح حل کرتے ہیں ان حصول کا یا تو بلیک آؤٹ کر دیا جاتا ہے یا ان کو حذر و کزدہ کی پیش کیا جاتا ہے۔ اس طرح فقہ اور حدیث کے خلاف انتشار بھی پیدا کرنے میں کامیابی ہوتی ہے اور علمیت و تفکر کی دعوتیں بھی قائم ہو جاتی ہیں۔

اربابِ حل و عقد، مجلسِ شوریٰ، عدالتوں اور تحقیقی و علمی اداروں اور فقہ کے مدارس فکر نے ایک خاص طرح نصوص کی تعبیر کرتے ہوئے سختی سے ملحوظ رکھا ہے اور تمام اختلافات کے درمیان جس پر اتفاق قائم رہا ہے اسے ہمارے نظامِ فقہ و قانون میں نصوص کے بعد ایک شرعی حجت کی حیثیت حاصل ہے۔ ایسی شرعی حجت کو توڑنے کے لیے محض ایک اندھا جذبہ اور ایک سرسری طرزِ فکر اور بازاری استہزاء و طنز تو کافی نہیں۔ اجماع کو اس طرح سے اگر کھیل بنا لیا جائے تو ایک قانون میراث ہی کے نہیں، تمام شعبوں کے قانونوں کے نیچے ادھر جائیں گے۔ آپ کے مطالبے کے مطابق یتیم پوتے کو وارث بنانا تو کوئی مشکل کام نہیں ہے لیکن اس سے قانون کا سارا عمل گر پڑتا ہے، اسے بچانا ضرور مشکل ہے۔

اجماع سے قطع نظر کہ مسئلہ کو حل کرنے کی پانچ صورتیں | ہم اپنی بات کو سمجھانے کے لیے تفصیل سے ان صورتوں کا تجزیہ کرتے ہیں جن کے ذریعے یتیم پوتے کو حصہ دلوانے کے لیے بحت و تمحیص ہو رہی ہے۔

صورت اول — یہ ہے کہ ہم شریعت کے قانون میراث میں تقدم و تاخر کا پورا سسٹم ہی ختم کر دیں اور الاقرب فالاقرب کے کلیے پر خط نسخ پھیر دیں۔ اب یتیم پوتا بڑی آسانی سے بیٹوں کے ساتھ وارث قرار پائے گا۔ لیکن ہمارے اس اجتہادی اقدام کا اثر سارے ہی نظامِ قانون کو اپنی پیٹ میں لے لیگا، یعنی اب ایک میت کے مرنے پر اس کے تمام کے تمام زندہ رشتہ دار بیک دم وارث ہونگے چاہے کسی کا درجہ قرابت کتنا مقدم ہو، اور کسی کا اتنا مؤخر۔ اور اس صورت کے اختیار کرنے سے اجماع تو کجا، خود نصوص پر پانی پھر جائے گا۔

صورت دوم — یہ ہے کہ تو صیكہ اللہ فی اولادکم میں سے لفظ اولاد کو لے کر ہم اس تحت بیٹوں اور پوتوں اور پڑپوتوں، نینر بیٹیوں، نواسیوں اور پڑنواسیوں سب کو جمع کر دیں۔ اور آگے پیچھے کی صفیں توڑ کر ساری اولاد کو ایک صف میں لاکھڑا کریں۔ اس اجتہاد کے ذریعے بھی پوتا کسی میت کے بیٹوں کے ہوتے ہوئے وارث بن جائے گا۔ یعنی مثال مذکورہ بالا میں اسلم اور اکرم کے ساتھ، ب، ج، د، س، ص، ط، ع، مل کر کل ۱۱ افراد برابر برابر کے وارث ہونگے اور ہر ایک کو ۱/۱۱ ترکہ ملے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ اجتہادی تجویز بھی نصوص پر ہاتھ صاف کر دیتی ہے۔ کیونکہ الاقرب فالاقرب کا کلیہ

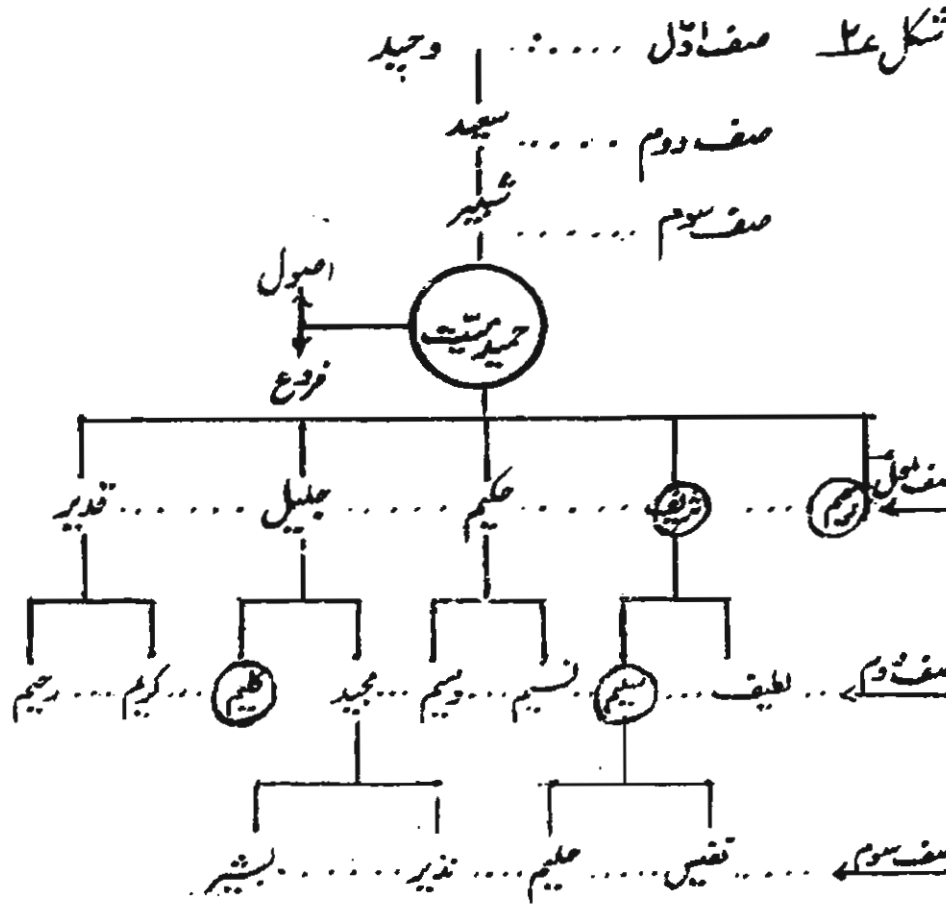
اولاد میں داخلی طور پر بھی فرق مراتب پیدا کرتا ہے۔

صورت سوم — یہ ہے کہ ہم منکرین حدیث کے نظریہ قائم مقامی کو اختیار کر لیں لیکن پہلے اس نظریے کو سمجھ لینا ضروری ہے۔ کہا جاتا ہے کہ فقہائے متقدمین نے خود قائم مقامی کا نظریہ اختیار کیا ہے۔ یعنی جو تعلق بالواسطہ ہونے کی وجہ سے مرتبہ ثانی پر ہوتا ہے وہ واسطہ کے بیچ میں سے ہٹ جانے پر مرتبہ اول پر آ جاتا ہے۔ جیسے ابوبکر ابن عباس کے قول "الْحَجَّاءُ ابْتُ دَاوُدَ بِرَ مَنْزِلَةِ بَابِ كَيْسَانَ" کے تحت باپ کو ملنے والی میراث دادا کے حصے میں جاتی ہے۔ اگر باپ کی خالی جگہ کو دادا پر کر سکتا ہے تو بیٹے کی خالی جگہ کو پوتا کیوں نہیں پر کر سکتا۔ دونوں صورتیں ایک دوسرے کا عکس ہیں تو جو فارمولہ ایک طرف چلتا ہے وہی دوسری طرف چلنا چاہیے۔ بڑا معقول استدلال ہے اور بڑا منصفانہ تقاضا ہے، مگر یہ جن مغالطوں کو اپنے اندر چھپائے ہوئے ہے ان کا تجزیہ کیسے بغیر ہم کو ٹی جی تلی رائے قائم نہیں کر سکتے۔

اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ اصول اور فروع میں یہ مسئلہ کیساں نہیں بیٹھا، بلکہ دونوں طرف بڑا فرق ہے۔ فرق یہ ہے کہ اصول میں مذکور (MALES) کی اقرب ترین صف کے اندر باپ ہمیشہ صرف ایک ہی پایا جاتا ہے، کسی کے دو یا چار، یا چھ باپ نہیں ہوتے، اسی طرح اس کے بعد کی صف میں دادا بھی صرف ایک ہی پایا جاتا ہے، پان، سات، دس ہیں نہیں ہوتے (ہم باپ کے چچاؤں کو درکنار رکھتے ہیں) چنانچہ وہاں مسئلہ یہ نہیں پیدا ہوتا کہ دو تین باپوں میں سے اگر ایک مر گیا ہو اور اس کا باپ (یعنی میت کا دادا) باقی ہو تو میت کے باپوں کے ساتھ اس دادا کو بھی وارث بنایا جائے یا نہیں۔

لہ دیکھا آپ نے، قانون کا مزاج ہی کلیات پسند ہے۔ جہاں ایک جزئی نظیر سامنے آتی تو ناگزیر ہو جاتا ہے کہ اس سے کلیہ بنے اور وہ سامنے قانون پر چھپا جائے۔ آپ اگر پوتے کو بیٹوں کے ساتھ وارث قرار دینے کی نظیر ایک مرتبہ قائم کر دیں تو لازماً یہ نظیر ایک یا چند کلیات کو جنم دے گی جن کی فطرت سامنے قانون پر چھپانے کے لیے زور کرے گی۔ پھر اگر بیٹے کلیات سابق کلیات سے متضاد ہوتے تو پوتے کو دھانچے کو تہ وبالا کر دیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر قانون میں کوئی نئی اجتہادی نظیر قائم کرتے ہوئے بڑی احتیاط سے کام لیا جاتا ہے۔

بخلاف اس کے فروع کی
اقرب ترین صف میں بیٹے
بھی کئی پلٹے جاسکتے ہیں
جن میں سے کچھ مرگئے ہوں
کچھ زندہ ہوں، اور بعد کی
صف میں پوتے بھی
کثیر التعداد ہو سکتے ہیں، اور
پھر اسی طرح پڑ پوتے وغیرہ
بھی بے شمار ہو سکتے ہیں۔
چنانچہ مسئلے کی یہ نوعیت
صرف فروع ہی میں پیدا ہوتی
ہے کہ میت کے صفِ اول



نوٹ: ۱۔ ترکہ کی تقسیم کے وقت جو لوگ فوت شدہ تھے ان کے ناموں کے گرد دائرہ ہے۔

کے اقربا (بیٹوں) کے ہوتے ہوئے اس کے صفِ دوم کے وراثا (یعنی پوتوں) کو، خصوصاً جبکہ وہ تقسیم ہوں
یہ یکدم ترکہ میں سے حصہ ملنا چاہیے یا نہیں؟

شکل ۲ میں اصول اور فروع کے دونوں دائروں میں مسئلہ کی نوعیت کا فرق واضح ہو سکتا ہے۔
اصول کی تین صفیں (اور ان سے اوپر جو بھی ہوں) ایک ہی ذریعہ پر مشتمل ہیں، لیکن فروع میں صفِ اول
میں ۵، صفِ دوم میں ۸، صفِ سوم میں ۴ وراثت موجود ہیں۔ چنانچہ میت کے باپ کی عدم موجودگی
میں دادا اس وجہ سے وراثت قرار پاتا ہے کہ صفِ اول (جس میں باپ تھا) میں کوئی ایک فرد بھی باقی
نہیں، وہ بالکل خالی ہو گئی ہے، ورنہ اگر باپ کثیر التعداد ہوتے اور چند کے مرنے کے بعد چند باقی ہوتے
تو دادا کو کچھ نہ ملتا۔ ٹھیک اسی اصول پر فروع میں جب کسی میت کے اقربا کی صفِ اول بالکل خالی ہو
جائے تو پیچھے کی پوری صفِ دہم کہ اس صف کا کوئی حصہ اٹھ کر مرتبہ اول پر آ جاتی ہے۔ لیکن جب

تک صف اول میں ایک متنفس بھی موجود ہوگا وہ صف دوم کے بیٹے حاجب ہوگا۔ ملاحظہ فرمائیے شکل

۳۔ حمید کے پساندہ اقربا

شکل ۳

حمید میت

کی تین صفوں میں ۱۳ افراد

موجود ہیں۔ اس کا ترکہ

لینے کے لیے جب تک

صف اول کا ایک فرد

بھی موجود ہے صف دوم

اور صف سوم زیر بحث

ہی نہیں آئے گی۔

صف اول:- (رحم) ... (شریف) ... حکیم ... جلیل ... قدیر

صف دوم:- لطیف ... (سیم) ... نسیم ... وسیم ... حمید ... (طیر) ... اکرم ... عیم

صف سوم:- نفیس ... عظیم ... تذیر ... بشیر

نوٹ:- ترکہ کی تقسیم کے وقت جو لوگ فوت شدہ تھے ان کے ناموں کے گرد دائرہ ہے۔

”قائم مقام“ (وارث) دراصل نیچے کی طرف سے نہیں تحقیق کیے جانے کہ نفیس اور حکیم کس کے قائم مقام یا وارث ہیں، بلکہ اوپر کی طرف سے دیکھا یہ جانا ہے کہ حمید (میت) کے قائم مقام یا وارث اولین مرتبہ پر کون لوگ ہیں۔

گویا باپ اور دادا والی صورت بیٹوں اور پوتوں والی صورت پر منطبق نہیں ہوتی کہ اُس سے قیاس کر کے یہاں کوئی فیصلہ کیا جاسکے۔ لیکن کہا جاسکتا ہے کہ فقہائے متقدمین نے خود ابن الابن کو بھی تو ابن قرار دیا ہے، لہذا شکل ۳ کے مطابق، اگر کے مر جانے کی صورت میں زید کے پوتوں ص، ط اور ع کو اگر اکبر کے مقام پر رکھا جائے تو اس میں کیا ہرج ہے۔ اچھا فرض کر لیجیے کہ ہم اس اجتہاد کو مان لیتے ہیں۔ اب ہوگا یہ کہ اسلم، اکرم، ص، ط اور ع میں زید کا ترکہ بالکل کیساں تقسیم ہوگا کیونکہ ہم نے اپنے سمجھے ہوئے فارمے کے مطابق اکبر کا درجہ اس کے بچوں کو دیا ہے، یا بالفاظ دیگر ان کو صف دوم سے اٹھا کر صف اول میں لاکھڑا کیا ہے۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ اگر اس تقسیم کے بعد اکرم یا اسلم مر جائے تو ان کے بیٹوں کا حصہ اکبر کے بیٹوں سے بہت کم رہے گا، نیز اسلم اور اکرم کی بیویاں تو ان کے ترکہ میں سے کچھ پالیں گی، لیکن اکبر کی بیوہ کو کچھ نہ ملے گا۔ خیر، ان اثرات کو الگ لکھتے ہوئے

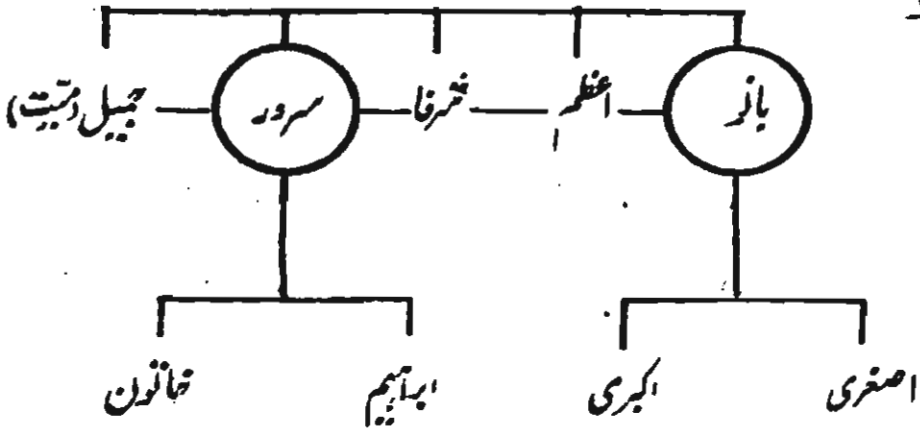
اصولی حیثیت سے غور کیجیے۔ ہم یہ کلیہ پہلے سوچ سمجھ کر طے کر آئے ہیں کہ بروئے حدیث "اولیٰ رجل ذکرتہ" جب تک مرتبہ عصوبت پر موجود ہو تو اس سے درجہ میں نیچے کے جتنے ممکن وارث بھی ہوں، وہ کچھ نہیں پاسکتے تو ہمارے قائم مقامی کے نظریے کا عمل اس کلیے کو ختم کرتا ہوا خود حدیث صریح کو پارا مال کر دیگا۔ زید کے وارثوں میں فوسی الفروض کوئی بھی نہیں کہ جس کا حصہ اہل مقدار میں متعین ہو، بلکہ اس کے وارث عصبیات کی نوعیت کے ہیں۔ ان عصبیات میں مرتبہ اول پر دو بیٹے ہیں، مرتبہ ثانی پر ہ پوتے۔ اب جب تک مرتبہ اول پر بیٹے موجود ہیں، پوتے کچھ نہیں پاسکتے، چاہے وہ یتیم ہوں، نوے لنگڑے ہوں، یا کسی اور مصیبت میں مبتلا ہوں۔

صورت چہارم — یہ ہے کہ منکرین حدیث کے نظریہ قائم مقامی کا وہ دوسرا تصور اختیار کیا جائے جو ہندو و واجی قانون سے مانور ہے، اور جو اخباری بحثوں میں زیادہ ترمیش کیا جا رہا ہے، نیز جس پر خود چیمہ صاحب کا ترمیمی مسودہ قانون مبنی ہے۔

وہ تصور یہ ہے کہ یتیم پوتا اگرچہ بذات خود وارث نہیں، لیکن وہ اپنے باپ کا حصہ واداسے لینے کا حق دار ہے۔ یعنی اس تصور کو قبول کرنے کے لیے یہیں شریعت اسلامیہ کا یہ بنیادی کلیہ ختم کرنا ہوگا کہ کسی شخص کی زندگی میں اس کے مال پر کسی کا حق میراث عائد نہیں ہوتا اور اس کلیے کو بھی ختم کرنا ہوگا کہ تقسیم ترکہ کے وقت زندہ وراثہ کے ساتھ کسی مردہ وارث کو مستحق بنا کے کھڑا نہیں کیا جاسکتا۔ اور ان دو کلیوں سے آزاد ہو کر جب ہم قانون سازی کریں گے تو ایک یتیم پوتے کے لیے ہی مردہ باپ کا حصہ زندہ نہیں رکھنا ہوگا بلکہ کسی مردہ وارث کے جو بھی ممکن حقدار مثلاً بیوی، ماں، بہن، بھائی وغیرہ موجود ہوں، وہ سب حصہ لینے کے حقدار ہونگے۔ اس تبدیلی کا اثر واضح کرنے کے لیے ہم چند مثالیں پیش کرتے ہیں:-

مثال ۱۔ - جمیل کے دو بھائی اور ایک بہن زندہ ہیں (والدین اور اولاد زندہ نہیں) تیسرا بھائی اس کی وفات سے قبل فوت ہو چکا تھا اور اس کی اولاد ہے۔ شکل ۱ کے لحاظ سے موجودہ شرعی قانون اعظم اور شرفا اور بانو میں پورا ترکہ تقسیم کر دیگا اور ابراہیم (بھتیجا) اور قانون (بھتیجی) اور اصغری

شکل ۴

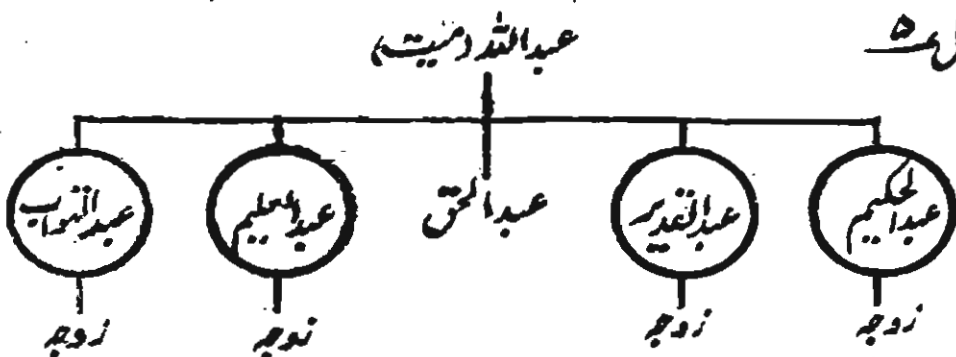


اور اکبری (بھانجیاں) کچھ نہ پائیں گی۔ بخلاف اس کے نئی اصلاح جو تجویز کی جا رہی ہے وہ عظیم اور شرفا کے ساتھ ابراہیم، خاتون اور اصغری و اکبری سب

کو وارث بناتی ہے۔ بھائیوں کے ہوتے ہوئے بھتیجیوں اور بھانجیوں کا شریک میراث ہونا ہمارے نظام قانون کے لیے بالکل انوکھا تصور ہے۔

مثال ب۔ اوپر شکل ۴ میں ہم نے جو صورت مسئلہ پیش کی تھی اس میں اکبر کے زندہ حصہ کو پاسنے والے قائم مقام صرف اس کے بیٹے ص، ط، ع ہی نہیں، اس کی بیوہ بھی ہو سکتی ہے۔ فرض کیجیے کہ ہم نے اسے اس کا حصہ دیا۔ اب زید کی زندہ شوہروں والی دو بیویاں تو محروم رہیں گی اور ایک بیوہ بہو وراثہ پانے گی۔ نیز زید کے بیٹوں کے ہوتے ہوئے ان کی تھاج کا شریک میراث ہونا پھر ایک ایسا واقعہ ہے جو اسلامی نظام وراثت میں قطعی طور پر نئی چیز ہے۔ اور فرض کیجیے کہ اکبر کی کوئی اولاد سرے سے موجود ہی نہیں، صرف ایک بیوہ ہے۔ یہ بیوہ آسم اور اکرم کے ساتھ اکبر کی قائم مقامی کی بنا پر برابر کا حصہ پائے گی۔ کیا یہ ایک معقول قانون ہوگا جو بیٹوں اور بیوہ کو ہم مرتبہ کر دے؟ اور آگے چلیے، فرض کیجیے کہ زید کے پانچ بیٹے تھے جن میں چار لاولد صرف بیویاں چھوڑ کر والد سے قبل وفات پا گئے، اور ایک زندہ ہے۔

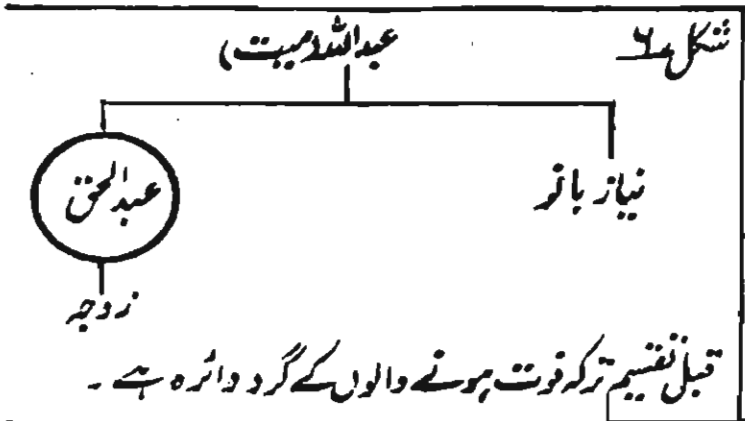
شکل ۵



اب چاروں بیوہ بہوؤں میں سے ہر ایک کو اس کے زندہ بیٹے کے مساوی حصہ ملے گا، حالانکہ اگر اس کی بیویاں بھی ہوتیں تو ان میں

(نوٹ) قبل تقسیم ترکہ مر جانے والوں کے ناموں کے گرو دائرہ سے

سے کوئی اپنے بھائی کے برابر حصہ نہ پاسکتی۔ بڑا معقول ہوگا وہ اجتہاد جو بیٹوں کو بیٹیوں سے بھی زیادہ آفریں بنا دے۔ ملاحظہ ہو شکل ۵۔ عبدالحق کے ساتھ بیوہ عبدالقدير، بیوہ عبدالحکیم، بیوہ عبدالقواب، بیوہ عبدالحکیم بالکل مساوی درجہ کی حصہ دار ہیں۔ اب $\frac{1}{8}$ ترکہ وہ لیں گی اور $\frac{1}{8}$ عبدالحق کو ملے گا۔ اس فرق کو شکل ۵ مزید واضح کرے گی۔ عبد اللہ کے ترکہ میں دو



حصہ دار ٹھہرے۔ ایک نیاز بانو، دختر، دوسرے بیوہ عبدالحق بحیثیت قائم مقام عبدالحق اور لطف یہ کہ بیٹی سے بیوہ کا حصہ دگنا ہو گیا۔ مثال ج۔ کسی میت کی بیوی کے ہوتے ہوئے اگر ایک ہی بیٹیا زندہ ہو، اور چار اس کی وفات سے قبل وفات پا چکے ہوں (چاہے انہوں نے چند منٹ ہی کے لیے زندگی پائی ہو) تو موجود شرعی قانون میں تقسیم یوں ہوگی :-

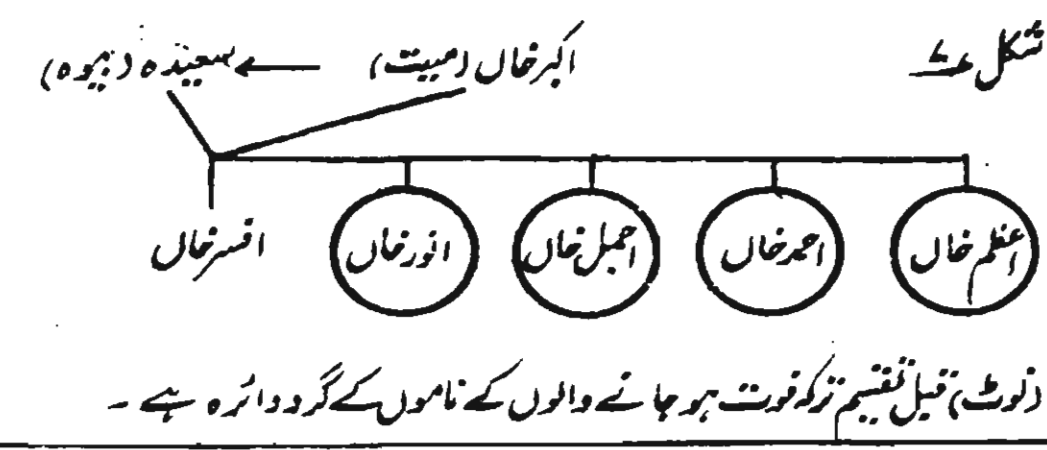
عبد اللہ میت

عبد الحق

نیاز بانو

زوجہ

قبل تقسیم ترکہ فوت ہونے والوں کے گرد دائرہ ہے۔



یہی زندگی پائی ہو تو موجود شرعی قانون میں تقسیم یوں ہوگی :-

بیوہ کا حصہ = $\frac{1}{8}$

بیٹے کا حصہ = $\frac{2}{8}$

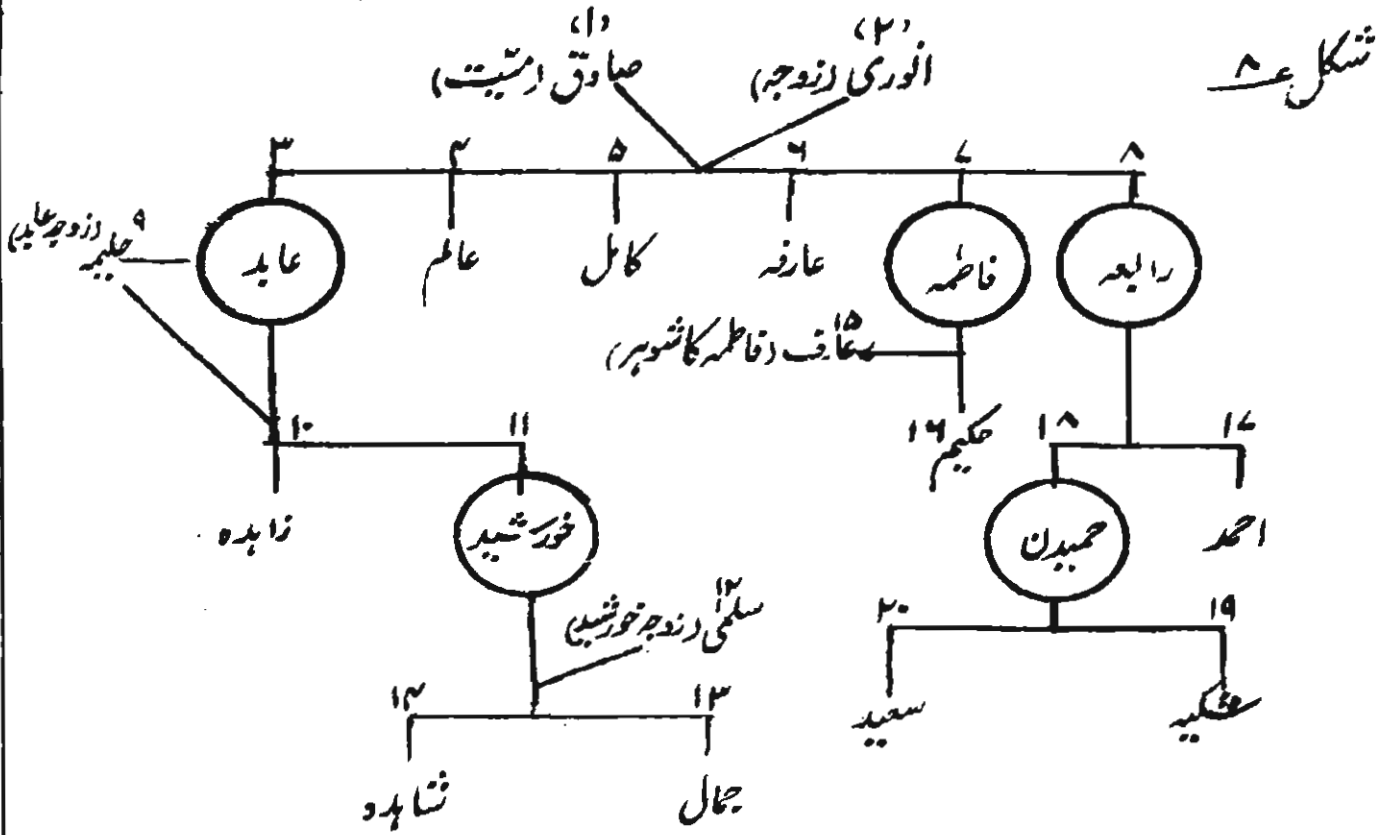
یعنی شکل ۶ کے بموجب $\frac{1}{8}$ سعدیہ لے گی اور $\frac{2}{8}$ افسر خاں کو ملے گا۔ لیکن نئی اجتہادی صورت میں تقسیم یوں ہوگی :-

$$\text{سعدیہ (بیوہ میت) کا اپنا حصہ} = \frac{1}{8} \quad (\text{باقی} = \frac{7}{8})$$

$$\text{مردہ بیٹوں کا زندہ شمار کیا جانے والا حصہ} = \frac{2}{8} \text{ کا } \frac{4}{5} = \frac{4}{10}$$

$$\text{سعدیہ کے حصے میں مردہ بیٹوں کی قائم مقامی کی وجہ سے مزید حصہ ملا دیا} = \frac{1}{8} + \frac{4}{10} = \frac{23}{40}$$

میت کے زندہ بیٹے افسر خاں کا حصہ جو باقی رہا = $\frac{4}{5} \times \frac{4}{8} = \frac{4}{10}$
 پہلے ماں بیٹے کے حق میں علی الترتیب ۱ : ۷ کا تناسب تھا، اب الٹ کر ۳ : ۷ ہو گیا۔



قبل تقسیم ترکہ فوت ہونے والوں کے ناموں کے گرد دائرے ہیں۔

مثال ۷۔ بصورت موجودہ صادق کے ترکہ کی تقسیم یوں ہوگی؟

انوری زوجہ صادق (۲) = کل کا $\frac{1}{8}$ (بقیہ $\frac{7}{8}$ اولاد میں)

عالم بیٹا (۴) کو = $\frac{4}{10}$

کامل بیٹا (۵) کو = $\frac{4}{10}$

عارف بیٹی (۶) کو = $\frac{4}{10}$

باقی کسی کو کچھ نہیں ملے گا

جدید مجوزہ صورت میں یہ تقسیم یوں ہوگی :-

صادق کی زوجہ انوری (۲) کو = $\frac{1}{8}$

بقیہ $\frac{۷}{۸}$ کی تقسیم اولاد میں: —

$$\frac{۷}{۳۶} = \text{عالم (۴) کو}$$

$$\frac{۷}{۳۶} = \text{کامل (۵) کو}$$

$$\frac{۷}{۶۲} = \text{عارفہ (۶) کو}$$

عابد مرحوم کا حصہ $\frac{۷}{۳۶} =$
فاطمہ مرحومہ (۷) = $\frac{۷}{۶۲}$
رابعہ (۸) = $\frac{۷}{۶۲}$

یہ حصے زندہ رکھ کر ان تینوں کے قائم مقاموں میں تقسیم کئے جائیں گے

عابد کے زندہ حصے کی تقسیم اس کے قائم مقاموں میں :-

$$\text{ماں انوری (۲) کو} \quad \left\{ \begin{array}{l} \frac{۷}{۲۱۶} = \frac{۱}{۴} \times \frac{۷}{۳۶} = \\ \frac{۷}{۲۸۸} = \frac{۱}{۸} \times \frac{۷}{۳۶} = \end{array} \right. \text{باقی بچا} = \frac{۱۱۹}{۸۶۴}$$

$$\text{حلیمہ زوجہ عابد (۹) کو} \quad \frac{۱۱۹}{۲۵۹۲} = \frac{۱}{۳} \times \frac{۱۱۹}{۸۶۴} =$$

$$\text{زاہدہ (۱۰) کو} \quad \frac{۱۱۹}{۲۵۹۲} = \frac{۱}{۳} \times \frac{۱۱۹}{۸۶۴} =$$

$$\text{خوشید مرحوم (۱۱) کا حصہ} \quad \frac{۱۱۹}{۱۲۹۶} = \frac{۲}{۳} \times \frac{۱۱۹}{۸۶۴} =$$

خوشید مرحوم کا حصہ اس کے قائم مقاموں میں یوں تقسیم کیا جائے گا :-

$$\text{خوشید کی والدہ حلیمہ (۹) کو} \quad \frac{۱۱۹}{۴۴۶۴} = \frac{۱}{۴} \times \frac{۱۱۹}{۱۲۹۶} =$$

$$\text{خوشید کی زوجہ سلمیٰ (۱۲) کو} \quad \frac{۱۱۹}{۱۰۳۶۸} = \frac{۱}{۸} \times \frac{۱۱۹}{۱۲۹۶} =$$

$$\text{جمال (۱۳) کو} \quad \frac{۲۰۲۳}{۳۶۶۵۶} = \frac{۲}{۳} \times \frac{۲۰۲۳}{۳۱۱۰۴} =$$

$$\text{نسابدہ (۱۴) کو} \quad \frac{۲۰۲۳}{۹۳۳۱۲} = \frac{۱}{۳} \times \frac{۲۰۲۳}{۳۱۱۰۴} =$$

اب ہم فاطمہ مرحومہ (۷) کا زندہ شمار کیا ہوا حصہ اس کے قائم مقاموں میں تقسیم کرتے ہیں :-

$$\text{فاطمہ کی والدہ انوری (۲) کو} \quad \frac{۷}{۲۳۲} = \frac{۱}{۴} \times \frac{۷}{۶۲} =$$

$$\text{فاطمہ کے شوہر عارف (۱۵) کو} \quad \frac{۷}{۲۸۸} = \frac{۱}{۴} \times \frac{۷}{۶۲} =$$

$$\text{فاطمہ کے بیٹے حکیم (۱۶) کو} \quad \frac{۲۹}{۸۶۴} = \text{باقی کل}$$

اب رابع مرحومہ (۸) کا زندہ شمار کیا ہوا حصہ یوں تقسیم ہوگا:-

$$\text{رابعہ کی والدہ انوری (۲) کو} = \frac{1}{4} \times \frac{25}{232} = \frac{25}{232} \text{ [باتی بچا = } \frac{35}{232} \text{]}$$

$$\text{احمد (۱۷) کو} = \frac{2}{3} \times \frac{25}{232} = \frac{25}{279}$$

$$\text{حمیدین (۱۸) کا زندہ حصہ} = \frac{1}{3} \times \frac{25}{232} = \frac{25}{1294} \text{ [یہ حصہ حمیدین کے قائم مقاموں میں شے گا۔]}$$

اب حمیدین (۱۸) کا حصہ اس کے قائم مقاموں کو یوں دیا جائے گا:-

$$\text{شکیلہ (۱۹) کو} = \frac{1}{3} \times \frac{25}{1294} = \frac{25}{3888}$$

$$\text{سعید (۲۰) کو} = \frac{2}{3} \times \frac{25}{1294} = \frac{25}{1922}$$

اب ذرا ان حصہ داروں کے حصے پر نظر ثانی بھی کر لیجئے جن کو ایک سے زیادہ مرتبہ حصے ملے ہیں:-

$$\frac{21}{214} = \begin{cases} \frac{1}{8} = \text{۱- انوری زوجہ صادق (۲) کو شوہر سے} \\ \frac{2}{214} = \text{عابد کے حصے سے} \\ \frac{2}{232} = \text{فاطمہ کے حصے سے} \\ \frac{2}{232} = \text{رابعہ کے حصے سے} \end{cases}$$

$$\frac{22}{1922} = \begin{cases} \frac{2}{388} = \text{۲- حلیمہ (۹) کو شوہر مرحوم کے حصے سے} \\ \frac{119}{4444} = \text{خمد شید کے حصے سے} \end{cases}$$

اب دیکھیے کہ اس دلچسپ تقسیم نے کیا کیا گل کھلائے ہیں:-

۱- صادق کی بیوی کو عام حالات میں $\frac{1}{8}$ ملتا، مگر اب وہ بیٹوں کے ہونے سے ہونے ہوئے $\frac{21}{214}$

پارہی ہے جو براہ راست نص قرآنی کے خلاف ہے۔

۲- صادق کی بیوی کے پہلے پہلہ اس کی بہو حلیمہ (۹) اور اس کی پڑبہو سلمیٰ (۱۲) وارث ٹھہری

لے ایک قابل غور سوال یہ بھی ہے کہ حمیدین مرحومہ (۱۸) کے قائم مقاموں میں اس کی والدہ رابعہ (۸) کیوں
دشمار کی جائے، جبکہ مرحومہ وراثت کا حصہ زندہ تسلیم کیا جائے، اور اسی طرح دوسرے موقعوں پر بھی یہی سوال پیدا ہوتا ہے۔

ہیں۔ بیوی کے ساتھ بیٹوں کا وارث ہو جانا آج سے پہلے شریعت میں نامعلوم تھا۔

۳۔ صادق کے بیٹوں کے ساتھ اس کے پوتے پوتیاں بھی، پڑپوتا اور پڑپوتی بھی، نواسا، پڑھاسا

اور پڑنواسی بھی شریک ترکہ ہو گئے۔ اس طرح ایک نئی شریعت وجود میں آئی ہے، نہ کہ اجتہاد!

۴۔ صادق کے بیٹوں عالم (۴) اور کامل (۵) کے ساتھ عارف داماد (۱۵) جبران دونوں کا بہنوئی ہے، صادق کے ترکہ کا حقدار بن گیا۔

۵۔ مجموعی فساد یہ رونما ہو گیا کہ ذوی الفرائض اور اولوالارحام باہم بالکل گڈ گڈ ہو گئے۔

۶۔ عصوبت کا سرے سے وہ تصور ہی کا عدم ہو گیا جو نص صریح پر ملنی تھا۔

یعنی آپ چلے تھے محض ایک پوتے کے لیے گنجائش پیدا کرنے کو، لیکن اس مقصد کے لیے

قائم مقامی کے نظریہ کے تحت مردہ وارثوں کے حصص زندہ فرض کرنے کا فارمولہ اجاگر کیا تو اس

نے شریعت کے قانون کے سائے ڈھانچے کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ اتنا ہی نہیں خود نصوص مجروح ہو گئیں

پھر کیا اس نظریہ کی کوئی جگہ یہاں نکلتی ہے؟

ہم کہتے ہیں کہ حدیث سے انکار کر کے صرف قرآن کو اگر کوئی شخص اوسط درجے کی عقل

کا استعمال کر کے بھی مسائل میراث پر منطبق کرے گا تو اس درجہ کی

چمکانہ فقہ تو پھر بھی پیدا نہ ہوگی۔

مذکورہ بالا صورتیں جو مجوزہ نظریہ کے تحت پیدا ہوتی ہیں، ان کے لیے سنت کا انکار کرنے

والے، عام تاریخ امت کے مواد کو کھنگال کر کوئی ٹوٹی بھوٹی ایک آدھ نظیر تو ایک ایک صورت کے

لیے سامنے لائیں۔ کسی شیعری کا فیصلہ، کسی خلیفہ راشد یا کم سے کم سلطان عادل کا فرمان، کسی

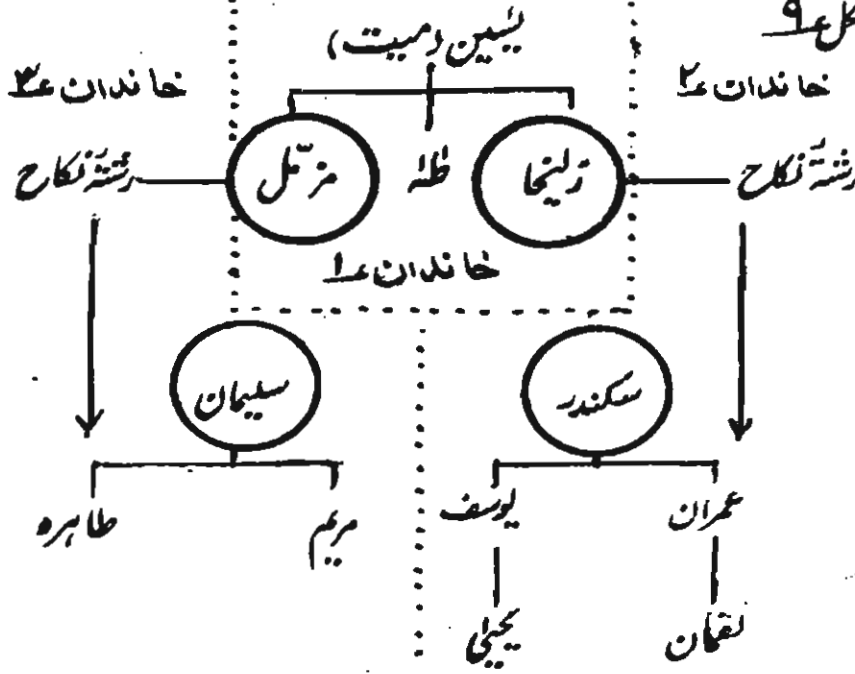
عدالت کا فیصلہ، کسی مستند قانون دان کی علمی رائے، کسی فقہی اسکول کے تحقیقی ادارات کا فتویٰ

کچھ تو ہونا چاہیے۔

مثال ۱۔ خاندان علی کا مورث اعلیٰ وفات پاتا ہے۔ موجودہ شرعی قانون کے تحت اس

کا کل ترکہ اس کا واحد زندہ بیٹا بوجہ عصوبت لے گا۔ اور کسی کا کوئی حق نہیں لیکن نئی اجتہادی

شکل ۹



تقسیم ترکہ سے قبل مر جانے والوں کے ناموں کے گرد دائرہ ہے۔

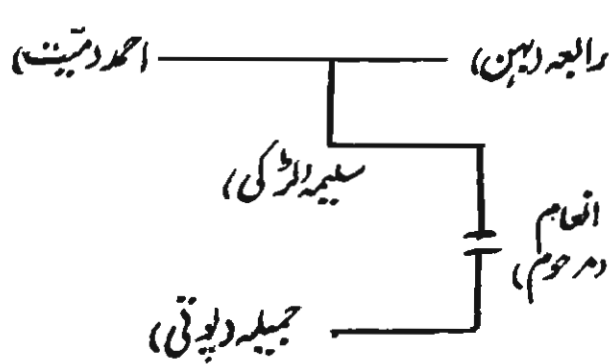
صورت میں ظنہ کو $\frac{1}{8}$ ملے گا، دوسرا $\frac{1}{8}$ مزمل مرحوم کا زندہ حصہ شمار ہو کر اس کی واحد قائم مقام بیوہ طاہرہ کو جا پہنچے گا اور اگر بالفرض طاہرہ بھی باقی نہ ہوتی تو یہ مریم کو جا ملتا۔ باقی رہا $\frac{1}{8}$ ، سو یسین کی مرحوم بیٹی زینجا کا زندہ حصہ شمار ہو کر اس کے

قائم مقام بیٹے لقمان کو (جو یسین کا نواسا) جا پہنچے گا۔ اس طرح ایک خاندان کے اندر مرتبہ عصوبت رکھنے والے قریب ترین وارث کی زندگی میں یسین کے ترکہ کا $\frac{1}{8}$ بالکل ایک الگ خاندان میں اور دوسرا $\frac{1}{8}$ بالکل ایک الگ خاندان میں دو پار کے ایسے عزیزوں کو جملے گا، جو مرے سے مرتبہ عصوبت رکھتے ہی نہیں۔ پھر کیا یہ صورت مضحکہ خیز نہ ہوگی کہ ظنہ (بیٹیا) اور طاہرہ (بہن) بالکل مساویانہ حصہ پائیں حالانکہ طاہرہ اگر یسین کی بیٹی بھی ہوتی تو $\frac{1}{8}$ سے زیادہ نہ پاتی۔ خود زینجا اگر زندہ ہوتی تو اسے $\frac{1}{8}$ ملتا، مگر کمال ہے اجتہاد کا کہ اب طاہرہ رشتہ بعید رکھنے کے باوجود $\frac{1}{8}$ پار ہی ہے۔ گویا اب وہ یسین کی بہن نہیں، اس کا ایک بیٹا بن گئی ہے۔ اسی طرح لقمان زینجا کی قائم مقامی کی وجہ سے بالکل ظنہ کی بہن کا درجہ پا گیا۔ اور اگر لقمان بھی موجود نہ ہوتا تو یہی رتبہ بلند یوسف کو ملتا، اور یوسف بھی مر گیا ہوتا تو یحییٰ اس کی جگہ لیتا۔ اسی طرح طاہرہ اگر زندہ نہ ہوتی تو اس کا مرتبہ مریم پاتی۔ خاندان عا کے زندہ بیٹے کے ہوتے ہوئے $\frac{3}{8}$ جائداد کا بالکل الگ دو خاندانوں میں جا پہنچنا، یہ شرعی قانون کا کرشمہ ہوگا یا بچوں کا کھیل!

مثال میں - تمیم پوتے کو ایک تو دادا سے میراث دلوائی گئی، لیکن دادا مرحوم سے جو ترکہ اس کی دادی نے پایا ہو، دادی کی وفات پر پھر اس میں سے تمیم کو اپنے باپ کی قائم مقامی کے فارموسے کے تحت ایک حصہ اور دلوانا ہوگا۔ اور اگر اس کے کسی چچا کی اولاد ختم ہوگئی تو اس کے مرنے پر جہاں اس کا زندہ بھائی ترکہ پائے گا وہاں اس تمیم کو بھی چچا کے مرحوم بھائی کا حق بطور قائم مقام کے دینا چاہیے۔ پھر اس کی ماں بھی مرگئی ہو تو بعد میں جب کبھی اس کا نانا، یا نانی فوت ہو تو نانا کی قائم مقامی کی وجہ سے اسے پھر حصہ دینا ہوگا۔ پھر اگر اس کی خالہ یا چھوٹی (کلالہ ہونے کی صورت میں) فوت ہو تو اس کی طرف سے بھی اس کے ماں اور باپ کا حصہ زندہ ہو کر محسوب ہوگا! اسی طرح ترکہ کی تقسیم جب بھی عمل میں آئے گی تو مردہ اغزہ بار بار اوپر سے نیچے کو بھی اور نیچے سے اوپر کو بھی، اور دونوں پہلوؤں میں بھی شمار ہونگے اور ان کے حصے بار بار محسوب کر کے ان کے قائم مقاموں میں بانٹنے ہونگے۔ انشاء اللہ ریاضی کی ہر پیچیدہ سے پیچیدہ کسر استعمال میں آئے گی اور یہاں تک کہ تقسیم اشیاء کا معاملہ اجزائے لایتجزئی تک جا پہنچے گا۔ اور چیزوں کے ایٹم گن گن کر بانٹے جائیں گے، اور آخر یہ دور بھی تو ایٹم کے کرشموں کا دور ہے! پھر تو تمام دنیا میں اس اجتہاد کے ڈنکے بج جائیں گے، اسلامی قانون کی بڑی قدر و قیمت ہوگی، اور تلامذوں کی "حماقتوں" کی اصلاح کرنے والے "مستروں" کے دماغوں کو سونے میں تو لاجائے گا۔

ایک اہم حدیث | لیکن ابھی ایک اور استدلال بھی ہے، بظاہر بڑا وزنی! بخاری کی ایک مضبوط روایت ہے کہ مشہور صحابی حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کے سامنے کوفہ کی گورنری کے زمانے میں یہ دریافت طلب

مسئلہ رکھا گیا کہ ایک شخص مر گیا ہے جس کی ایک



ڑکی، ایک پوتی اور ایک بہن موجود ہیں۔ ان میں سے کس کو کتنا حصہ ترکہ میں ملے گا۔ آپ نے جواب دیا کہ ڑکی کو $\frac{1}{4}$ ، بہن کو $\frac{1}{4}$ دینا جائے، پوتی محروم ہے۔ لیکن سائل کو مشورہ دیا کہ وہ

قانون میراث کے ماہر خصوصی (SPECIALIST) حضرت ابن مسعود سے بھی جا کر دریافت کرے۔ وہ حضرت ابن مسعود کی خدمت میں پہنچا۔ آپ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری کے فتوے کی تائید کرنے سے معذرت کی۔ پھر فرمایا کہ خود نبی صلعم نے اس مسئلہ کو یوں حل فرمایا کہ لڑکی (سلیمہ) کو ترکہ کا $\frac{1}{4}$ ، پوتی (جمیلہ) کو $\frac{1}{4}$ اور باقی $\frac{1}{2}$ بہن (رابعہ) کو دیا جائے۔ سائل پٹ کر پھر حضرت ابو موسیٰ اشعری کے سامنے حاضر ہوا اور حضرت ابن مسعود کا فتویٰ ان کے سامنے رکھا۔ اس پر انہوں نے اپنا فتویٰ واپس لیتے ہوئے کہا کہ اس خاص صنف کے موجود ہونے ہوئے مجھ سے دریافت کرنے کی ضرورت نہیں۔

واضح رہے کہ اس حدیث کی صحت پر کامل اتفاق ہے۔

کہا جا سکتا ہے اور ضرور کہا جانا چاہیے کہ جب بیٹی کی موجودگی میں پوتی کو میراث مل سکتی ہے تو ٹھیک اسی کے مطابق بیٹے کے ہوتے ہوئے پوتے کو بھی ملنی چاہیے۔

ہم مان لیں گے، لیکن پہلے تحقیق یہ کرنا ہے کہ یہ تقسیم کس فارمولے کے تحت ہے۔ اگر فارمولا وہی ہے جسے آپ بیٹے اور پوتے کے معاملے میں نافذ کرنا چاہتے ہیں تو پھر کوئی اختلاف باقی نہیں رہتا۔ آئیے اب حدیث مذکورہ کی مثال پر آپ کا فارمولا چسپاں کر کے دیکھیں۔

سلیمہ کے ساتھ ہم نے انعام کا حصہ زندہ فرض کیا تو تقسیم یوں ہوئی :-

$$\text{سلیمہ (لڑکی)} = \frac{1}{4}$$

$$\text{انعام مرحوم (لڑکا)} = \frac{1}{4} \quad (\text{یہ حصہ زندہ رکھا گیا})$$

اب ہم انعام کا قائم مقام ٹوہوٹڈنے نکلے تو ہمیں جمیلہ ملی۔ لہذا جمیلہ کو $\frac{1}{4}$ ملے گا۔ لیکن کیا یہ تعجب کا مقام نہیں کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری تو پوتی کو سرے سے محروم رکھ رہے تھے، اور پھر جس حدیث کے منصوص حکم نے حضرت ابو موسیٰ اشعری کے فتوے کو منسوخ کر دیا وہ بھی پوتی کو $\frac{1}{4}$ دیتی ہے، اور آپ کا جدید اجتہادی فارمولا اپنی چول نہ اس شکل سے ملاتا ہے، نہ اس شکل سے!

پھر کیا آپ حدیث صریح اور متفق علیہ کے مقابلے میں اپنے اجتہاد کا جھنڈا لگا کر کے کھڑے ہو جائیں گے اور جو قانون سازی آپ فرمائیں گے وہ اسلامی فقہ و قانون کی تعریف میں آئے گی۔ سوچئے، فارمولا وضع

کرتے ہیں، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس حدیث کے سمجھنے میں کہیں آپ سے غلطی تو نہیں ہو رہی؟ (ایک منکر حدیث یہاں آکر حدیث کو محبت ماننے سے انکار کرنے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں رکھتا۔ وہ کہے گا کہ یہ روایات گروں کا نتیجہ کاوش ہے، اسی لیے تو بات نہ ادرہ بنتی ہے، نہ ادرہ! لیکن یہاں ہم تجت حدیث کی بحت چھڑتے سے معذوری کا اظہار کرتے ہیں)۔

بنیادی غلطی لڑکی اور لڑکے کے معاملے کو ایک قرار دینے میں ہو رہی ہے۔ مثلاً جس طرح حدیث کی نظیر سے آپ نے استدلال کیا، کیا ویسا ہی استدلال یہ بھی نہیں کہ جب لڑکی اور پوتی کے ہوتے ہوئے بہن کو حصہ ملتا ہے تو لڑکے اور پوتے کے موجود ہوتے ہوئے بھی بہن (نیز بھائی) کو حصہ ملنا چاہیے لیکن جب تک قرآن اور حدیث ذہنی اصلی شکل میں سامنے رہیں گے ایسا نہیں ہو سکتا۔ استدلال مرے سے غلط ہے۔

درحقیقت بیٹا عصبہ کی حیثیت رکھتا ہے اور ذوی الفروض سے بچا ہوا اریا ذوی الفروض نہ ہوں تو کل مال لے جاتا ہے۔ پھر کوئی بیٹا نہ ہو تو پوتا اسی مرتبہ عصوبت پر آجاتا ہے۔ لیکن بیٹی عصبہ نہیں ہے نہ پوتی اس کے نہ ہونے کی صورت میں پوتے کا درجہ عصوبت حاصل کرتی ہے۔ بیٹی عصبہ ہوتی تو پوتی کا کوئی استحقاق نہ تھا، لیکن اسے صاحبہ فرض ہونے کی حیثیت سے اکیلی ہونے کی صورت میں $\frac{1}{2}$ مال ملے کہ جب ہم باقی کو ٹھکانے لگانے چلے تو وہ چونکہ عصوبت نہ رکھنے کی وجہ سے پوتی کے لیے اپنا مفروضہ لینے کے بعد بیٹے کی طرح کلیتہً حاجب نہیں ہے۔ اس لیے پوتی کے لیے گنجائش نکل آتی ہے۔ چنانچہ اسے بروٹے حدیث $\frac{1}{2}$ دیا گیا اور اس طرح ترکہ کا جملہ $\frac{2}{3}$ ٹھکانے لگ گیا جو دو بیٹیوں کے حصے کے مساوی

۱۔ پوتی کو یہاں بہن لڑکی کے لیا تو گیا ہے، مگر بالکل مساویانہ حیثیت میں نہیں، کیونکہ بلا واسطہ بیٹی ایک ہے اور اس کا حصہ متعین ہے جو فرضیت رکھتا ہے۔ اس کا لحاظ ضروری تھا۔ مسئلہ کے حل میں خوبی یہ ہے کہ اس میں یہ یکم دو قاعدوں کو نافذ کر کے انہیں پورا کیا گیا ہے۔ ایک یہ کہ ایک بیٹی کو $\frac{1}{2}$ ملے۔ دوسرے یہ کہ دو بیٹیوں کا $\frac{2}{3}$ ہوتا ہے۔ چنانچہ بیٹی کو ایک ہونے کی وجہ سے $\frac{1}{2}$ مل گیا اور پوتی کو $\frac{1}{2}$ دینے سے بیٹی اور پوتی $\frac{2}{3}$ میں جمع ہو گئیں۔ یہاں ہم مزید تفصیل نہیں دے سکتے۔

ہے۔ ما بقی کے لیے آنحضرت صلعم کی طرف سے نص قطعی موجود ہے کہ "اجعلوا للاخوات مع البنات عصبۃ"۔ پس بھائی نہ ہوں تو بہن کو (واقع رہے کہ صرف بیٹیاں ہونے کی صورت میں) اس حدیث کے تحت عصبۃ قرار دے کر ۱/۴ حصہ دے دیا جائیگا۔ یہی صورت تھی جسے حضرت ابن مسعود نے اختیار فرمایا۔ اب خوب سمجھ لیجیے کہ یہ حدیث جسے آپ اپنے استدلال کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے، یہ قطعی طور پر آپ کے نظریے کی تردید کرتی ہے اور اس سے استدلال کرنے کا حق نہیں پہنچتا ہے۔ یہ زندہ چچاؤں کے ہوتے ہوئے یتیم پوتے کے وارث بن سکنے کے لیے اپنے اندر دلیل نہیں رکھتی ہے۔ کیونکہ یہ کسی مردہ وارث کا حصہ زندہ رکھ کر اس کے قائم مقاموں کو پہنچانے والے نظریہ کی بالکل ضد ہے۔ مسئلہ زیر بحث میں بیٹی کی حیثیت فرضیت کے بخلاف زندہ بیٹے چونکہ عصبیات ہوتے ہیں اور اقرب ترین، لہذا ازوی الفروض کے بعد، وہ پوتے کا پورا ترکہ لے جائیں گے اور ان کی عدم موجودگی میں ان سے چچے کی صفوں کے جو افراد عصبیت کے مقام پر آسکتے ہیں وہ ان کی زندگی میں کچھ نہ پائیں گے۔ چنانچہ اگر کسی شخص کے ۱۲ بیٹوں میں سے ۱۱ یتیم اولاد چھوڑ کر مر گئے ہوں اور صرف ایک ہی زندہ باقی ہو تو اس کا کل ترکہ عصبیت کے مرتبہ اول کی وجہ سے ایک ہی بیٹے کو مل جائے گا۔ ابن الابن کے ابن ہونے کا نامور لا فقہار نے وہاں استعمال کیا ہے جہاں مرتبہ عصبیت پر کوئی ابن موجود نہ ہو۔ اس صورت میں تمام کے تمام پوتے عصبیت کے مساویانہ مرتبہ پر آجائیں گے، اور وہ نہ ہوں تو پوتے وغیرہ!

صورت پنجم — یہ ہے کہ آنکھیں بند کر کے اسلامی فقہ و قانون کے فنی مسائل کو سمجھ بوجھ بغیر اور کلیات اور فارمولوں کا لحاظ کیے بغیر ایک حل قانون سازی کے اختیار است کے بل پر شریعت پر ٹھونس دیں۔ اس جاہلانہ صورت کا مقابلہ استدلال سے کیا جاسکتا ہے۔ اس کا جواب صرف رائے عام کی قوت سے دیا جاسکتا ہے۔ یہ تو حکم کھلا شائع کی حکم نامہ مسئلہ کرنے کی اور شریعت کے قانون کو درہم برہم کرنے کی صورت ہے!

مسئلہ کا حل کیا ہے؟

مسئلہ کا حل قرین ادنیٰ میں یتیم پوتے کی محرومی شدت ۱۲ صدیوں میں بہر حال بارہا ایک واقعہ کی حیثیت

میں امت کے سامنے آئی ہوگی، لیکن کیا وجہ ہے کہ نہ اس مسئلے پر کوئی اضطراب پایا گیا ہے اور نہ کوئی مفصل اختلافی بحث ملتی ہے؟ اس کے دو وجوہ ہیں :-

۱) مسلمانوں کی پوری امت میں ایک طرف شریعت کے بارے میں لپورا لپورا جذبہ احترام کا فرما رہا ہے، یعنی جس مسئلے میں انہوں نے دیکھا کہ شریعت یوں کہتی ہے تو پھر اس کے اندر بظاہر کسی ناخوشگوار پہلو کے موجود ہوتے ہوئے بھی انہوں نے مبرا تسلیم کر دیا ہے۔ دوسری طرف ان میں سنت نبوی کے شرعی حجت و سند ہونے پر ایمان کا فرما تھا اور کوئی گروہ ان کے اندر ایسا پنپ نہیں سکا جو سنت پر حملہ آور ہونے کے لیے قانون شرعی میں کیڑے ڈالنے کی جسارت کر سکتا، کہ جس سے متاثر ہو کر وہ ذہنی انتشار میں پڑ جاتے۔ تیسری طرف قانونیات کے دائرے میں وہ صحابہ تابعین، تبع تابعین اور ائمہ فقہاء اور اپنے وقت کے علمائے قانون کے علم و تحقیق پر اعتماد رکھتے تھے اور یہ طرز فکر ان میں کبھی نہیں پایا گیا کہ وہ سرمایہ فقہ و قانون کو چند ملاؤں کے تیرنگوں کا حاصل یا ایک عجمی سازش کا نتیجہ قرار دیں۔

یہیم پوتا اگر محروم رہ جاتا تھا تو مسلمانوں نے اس کے مسئلے کو سوسائٹی میں دوسرے بہت سے ورثہ نہ پانے والے یتیمی و ایامی کے مسئلے کی سطح پر ہی رکھ کر حل کیا ہے۔ وہ اس طرح کی شاذ قابل حتم صورتوں کو دیکھ کر سنت نبوی یا سرمایہ فقہ و قانون کے بارے میں شبہ میں نہیں پڑے۔

گویا اپنے دین کا پورا شعور، سنت پر ایمان، آجماع کا احترام اور قانونیات میں ماہرین فن کے علم و تحقیق پر اعتماد رکھنے کے لحاظ سے جب تک سوسائٹی تربیت یافتہ رہی، تو یہ مسئلہ اس طرح فتنہ کی صورت اختیار کر کے کبھی سامنے نہیں آیا۔ اور اب تربیت کا یہی خلا ہے جو مذہبی فتنہ گروں کو سنت اور فقہ و قانون کے خلاف معرکہ آرائی تک کا موقع دے رہا ہے۔

۱۲) اسلام کے معیاری دور میں، بلکہ لگاؤ شروع ہونے کے بعد تک بھی مسلم معاشرے میں عیم لپوتے کے مسئلے کے مناسب حل عملاً کارفرما رہے ہیں۔ یہ حل حسب ذیل تھے :-

۱۔ اس جذبہ کو منکرین حدیث نے "افیون زدگی" سے تشبیہ دی ہے

ایک یہ کہ اپنی اہل جائداد میں وصیت کا جو حق ہر شخص کو شریعت نے دیا ہے اور جسے بعض علما نے قیاساً بھی ماننے والے ہیں، اس کا مدعا جہاں یہ تھا کہ مرنے سے پہلے آدمی سوسائٹی کی اجتماعی ضروریات کے لیے کچھ وقف چھوڑ جائے، اور یہ تھا کہ وہ ایسے اقربا کے خاص احسانات یا خدمات کا صلہ دے سکے جو اس کے وارث نہیں ہیں، وہاں بدرجہ اتم یہ بھی تھا کہ قانون کے رُوسے جو اقربا محروم رہ جاتے ہیں لیکن وہ سہائے امداد کے محتاج ہوں ان کے لیے سروسامان کیا جاسکے۔ اور وہ صالح جذبات کا رفرماتے جو ان مقاصد کے لیے وصیت کرنے کے محرک ہو سکیں۔

دوسرے یہ کہ کوئی شخص جب اپنے ترکے سے بعض قریبی عزیزوں، خصوصاً یتیموں اور بیواؤں کی محرومی کا اندیشہ محسوس کرتا تھا تو وہ زندگی میں مہربان کر کے اس اندیشے کا سدباب کر لیتا تھا۔ تیسرے یہ کہ جب کسی شاذ صورت میں بے سہارا یتیم پتے پتیاں واداعا کی میراث سے محروم رہ جاتے تھے تو ان کی کفالت دوسرے پرستی کی ذمہ داری ان کے چچاؤں پر عاید ہوتی تھی۔ اس سلسلے میں یہ واضح کر دینا مناسب ہو گا کہ حضرت عمرؓ نے چچاؤں کو یہ ذمہ داری اٹھانے پر اپنے دور خلافت میں مجبور کیا ہے۔ افسوس ہے کہ اس وقت حوالہ مستحضر نہیں۔ یہ اس لیے بھی مناسب ہے کہ ہر یتیم لہجے کا دادا یا ہر یتیم بچے کا والد ضروری نہیں کہ میراث چھوڑ کر مرے! اکثر حالات میں یتیموں کی کفالت قریبی سرپرستوں پر لازم آئے گی۔

چوتھے یہ کہ یتیموں، بیواؤں اور عام بے سہارا لوگوں کے لیے ایک مستقل حل اسلامی بیت المال کا وجود تھا یعنی ہر بچے، بوڑھے یا عورت کی کنیل اور ہر پیرت اسلامی سوسائٹی اور اسلامی حکومت ہوتی تھی۔ اور وہ اپنے اجتماعی خزانے کے ذریعے اسے سنبھالتی تھی۔

اب آپ نہ تو مسلمانوں کی صحیح ذہنی تربیت ہی کا کوئی سامان کرتے ہیں، نہ سوسائٹی میں محروم رہنے والے اقربا کے لیے وصیت اور مہربان کی ترغیب عام کرتے ہیں، نہ آپ یتیم پوتوں کے لیے چچاؤں کی کفالت بہم پہنچانے کی کوئی صورت پیدا کرتے ہیں، اور پھر نہ محرومین و معدومین کے لیے اجتماعی سہارا ہی بہم پہنچاتے ہیں۔ ان سارے خلافوں کو جو ان کا تہوں پر قرار دیکھ کر آپ پر انور ایک ایسی صورت

سے مشاہدہ کرنے پر صرف فرمایا ہے میں جس کے لیے اسلامی قانون میں کھپت کی گنجائش بغیر اس کے ڈھانچے کو توڑے پیدا نہیں کی جاسکتی۔ اور یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ایک خاص کیل یا پیچ کو کسی مشین میں نصب کرنے کے لیے پونڈی مشین کو چور چور کر کے مشین ہی ایک نئی بنا ڈالی جائے۔

قانون سازی کے ذریعے مسئلے | ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ سو سائٹی کے موجودہ حالات کو مختلف پہلوؤں کے حل کی مناسب صورتیں بدلنے میں وقت لگے گا، اور پیش نظر مسئلے میں ہمیں فوری قانونی حل مطلوب ہے۔ یہ قانونی حل چند ایسے طریقوں سے کیا جاسکتا ہے جو شرعی قانون کی مجموعی ساخت کو تباہ نہیں کرتے۔ بحالات موجودہ ذیل کی صورتیں اختیار کی جاسکتی ہیں :-

۱) — یتیم پوتے کو دادا سے میراث دلوانے کے لیے ایک قانونی دروازہ قاعدہ وصیت کے تحت کھولا جاسکتا ہے۔ اس کی نظیر مصر میں قائم ہو چکی ہے۔ حکومت مصر نے اس مسئلے میں انکارِ حدیث اور تخریبِ فقہ کا راستہ اختیار کرنے کے بجائے علماء سے استصواب کیا اور علماء نے بالاتفاق ایک صورت تجویز کر دی۔ اس صورت کی بناء وصیت کے وجوب کے نظریے پر رکھی گئی جو پہلے سے جاری ایک نہ ایک فقہی مکتب خیال کے مختارات میں شامل رہا ہے۔ مصری قانون یتیم پوتوں وغیرہ کے ہونے کی صورت میں دادا کے لیے وصیت کو لازم سمجھ کر اس کی موت پر اس کے ترکہ کی ۱/۲ کی حد تک رقم از کم اتنی مقدار جتنی یتیم پوتوں کے والد کو ملتی ہے کے لیے وصیت کو موجود قرار دیا ہے۔ اگرچہ دادا یہ وصیت نہ کر سکا ہو۔ نیز اگر اس نے کسی وصیت کے ذریعے اپنے یتیم پوتوں پوتیوں اور نواسوں نواسیوں وغیرہ کے علاوہ کسی اور رشتہ دار کو ترکہ کا حق دیا ہو تو یہ وصیت ۱/۲ ترکہ کے اس مانقی کی حد تک پوری کی جاتی ہے جو یتیم پوتوں پوتیوں اور نواسوں نواسیوں وغیرہ کو مذکورہ بالا مقدم تر قانونی وصیت کے مطابق ان کا حق ادا کرنے کے بعد بچ رہے۔ (ملاحظہ ہو: "المواریث الاسلامیہ" مولفہ احمد کامل دفعہ ۷۶ صفحہ ۲۸-۳۷- مطبوعہ ۱۹۵۵ء)

یہ معاملہ ہزار قابل بحث و اختلاف ہو، مگر اسلامی نظام فقہ میں چونکہ اس کی نظر ماتی بنیاد موجود ہے، نیز اس سے کوئی قانونی کلیہ نہیں ٹوٹتا، اور یتیم پوتوں پوتیوں اور نواسوں نواسیوں کا وہی حصہ بھی

مل جاتا ہے جو کسی دوسری طرح دیا جائے تو کسی نہ کسی طرف سے شرعی قانون کے ڈھانچے کو بہر حال ضرر پہنچتا ہے۔

(۲) — لوگوں کے لیے اپنے ایسے عزیزوں کے حق میں جو ان کے ترکہ سے حصہ نہ پانے والے ہوں زندگی میں مہربان کرنے کا جو دروازہ شریعت اسلامیہ نے کھول رکھا تھا اُس پر بھاری ٹیکسوں اور دوسری پابندیوں کے جو پہرے بٹھا دیئے گئے ہیں، اُن کو ہٹا دینے کے لیے ترمیمی قانون سازی کی ضرورت ہے۔ وصیت سے بھی زیادہ بہتر شکل یہ ہے کہ دادا یا نانا اپنے یتیم پوتوں یا نواسوں کے لیے اپنی زندگی میں معقول بندوبست کر کے رخصت ہو۔

(۳) — بروئے قانون ہر یتیم پوتے یا نواسے — خصوصاً جو محروم الارث بھی ہو، یا جس کا دادا یا نانا کوئی جائیداد رکھتا ہی نہ ہو — کی کفالت دوسرے پرستی کا بار چھاپوں یا ماموؤں پر ڈالا جانا چاہیے۔ اسی طرح دوسرے تمام تیامی و ایامی کے بائے میں اُن کے اقربا کی ذمہ داریاں کسی نہ کسی حد تک قانونی طور پر کی جاسکتی ہیں۔ ایسا قانونی اقدام حضرت عمرؓ کی قائم کردہ نظیر پر مبنی ہوگا۔

(۴) — مذکورہ بالا تین باتوں میں سے ایک یا چند کے اختیار کرنے کے ساتھ بالکل متوازی طور پر جو چوتھی صورت اصلاح پیدا کی جانی چاہیے وہ یہ ہے کہ ملک کے تمام تیامی، ایامی اور معذوروں کے لیے حکومت کی طرف سے قانوناً کفالت کی ضمانت یوم پہنچائی جائے۔ اس کام کے لیے حاجت مندوں اور معذوروں کی لسٹیں بنا کر بجٹ میں باقاعدہ مد رکھی جائے۔ اور اگر میر دست اس ذمہ داری کو حکومت پوری وسعت کے ساتھ نہ سہار سکے تو اقبال چیمبر صاحب جیسے مجسمہ ہائے رحم و شفقت ذرا تہمت سے کام لیں تو کم سے کم محروم الارث رہ جانے والے یتیم پوتوں اور نواسوں اور بھتیجوں وغیرہ کے لیے جو صوبے بھر میں بہت تھوڑی تعداد رکھتے ہوں گے) سرکاری خزانے سے وظیفہ کفالت مدد مع تعلیم و معالجہ کی سہولتوں کے) کا انتظام کر دیا جائے۔ اس معاملے میں صریح احادیث اور قطعی طور پر ثابت شدہ سنت نبویؐ وال ہے۔ آپ نے قرض چھوڑ کر مرنے والے، اور یتیم اور بیواؤں کو چھوڑ کر رخصت ہونے والے مسلمانوں کے بائے میں ساری ذمہ داری بحیثیت اسلامی ریاست کے کا پرواز

(HEAD) کے اپنے سر لی تھی۔ یہ ذمہ داری اب ہر اس مسلم حکومت پر عاید ہوتی ہے جو نبی صلعم کے ویسے ہوئے نظام کو چلائے۔

جس شریعت کے قانون کے زیر اثر کچھ یتیم محروم رہتے تھے اُس نے اُن یتیموں کے لیے انتظامات بھی کیے تھے۔ لیکن اُن انتظامات کو عمل میں لانے کی ذمہ داری تو ہماری حکومت کے کارہ پرداز سرس نہیں، اور پھر محرومی کے مسئلے پر ملاؤں کو کوئیں اور شریعت کے قانونی نظام کو دہم برہم کرنے پر آتائیں تو یہ دھاندلی معقولیت سے بہر حال کوسوں دور ہے۔

ہم مذکورہ بالاتدابیر کو پیش کر کے پوچھتے ہیں کہ کیا ان سے مسئلہ معقول طریق سے حل ہوتا ہے یا نہیں؟ پس اگر مدعا اس خاص مسئلے کا حل کرنا ہو، تو راستہ صاف ہے، لیکن اس مسئلے کی آڑ میں اگر نیت کچھ اور ہو تو اس کچھ اور کو الگ زیر بحث لایا جاسکتا ہے۔

اقبال چیمپ صاحب سے خصوصی گزارش

ادپر کے صفحات میں جو دلائل شرعی قانون وراثت کے بارے میں پیش کیے گئے ہیں، اگر آپ کو اس قانون کی بنیادوں اور مآخذ میں کوئی اختلاف نہ ہو تو نوعیت مسئلہ کو سمجھنے میں ضروری حد تک یہ مدد دے سکیں گے۔ ان کے مطالعہ سے آپ کو یہ بھی اندازہ ہو جائے گا کہ یہ قانون ایسا محدود میدان تک و نماز فراہم نہیں کرتا کہ پروگنڈے اور دوٹوں کی تعداد سے جو شے بھی کسی اسمبلی میں پاس کر ڈالی جائے وہ آپ سے آپ قانون شرعی قرار پائے۔ خدا اور اس کے رسول کے صریح احکام اور ان احکام کے واضح اشارات و دلالت راجح پر اجماع بھی ہے، کے مقابلے میں ان اسمبلیوں کا یہ اختیار سرے سے قابل تسلیم نہیں ہے کہ وہ مجرد اکثریت کے بل پر جو چاہیں فیصلہ کر ڈالیں۔ ان کو بہر حال کتاب و سنت اور اجماع کے حدود میں رہ کر کام کرنا ہوگا۔ لیکن ان حدود کو اگر یہ توڑنے پر تامل جائیں اور شرعی مسائل میں اپنے آزادانہ فیصلے نافذ کریں تو اس سے بہتر یہ ہے کہ قانون شریعت کو حکم کھٹا چھوڑ کر جس دوسری شریعت پر دل ٹھکے، اُسے اختیار کریں، یا جو نئی شریعت چاہیں بنائیں۔

ایسے آزادانہ فیصلوں سے قانون شریعت وجود نہیں پاتا۔

آپ کے تہیمی مسودہ قانون میں دو غلطیاں ہیں:-

ایک یہ کہ شریعت اسلامیہ کے قانون میراث میں جدی اور خود پیدا کردہ جائداد و املاک کی تیز کا کوئی نشان نہیں ملتا، حالانکہ آپ دونوں میں فرق کر رہے ہیں۔ قرآن، حدیث، اجماع و تہیموں اس کے خلاف ہیں۔

دوسرے یہ کہ آپ کے الفاظہ... گویا کہ متذکرہ اشخاص آخری مالک کی وفات کے فوراً ہی بعد فوت ہوئے؟ میں جس مفروضہ کو واقعہ بنا کر قانون پر اثر انداز کیا گیا ہے، یعنی آخری مالک کی وفات سے قبل فوت ہونے والوں کا حق اس کے ترکہ میں قائم کیا گیا ہے، اس مفروضہ کو قرآن، حدیث یا اجماع ترکہ، کسی تہیم سے درجے کی عدالتی نظیر یا کسی مفتی کے شخصی فتویٰ تک میں آج تک اس ڈھنگ سے استعمال نہیں کیا گیا۔ یا یوں کہنا چاہیے کہ کسی مورث کی زندگی میں کسی ممکن وارث کا حق وراثت اس کے املاک پر عائد نہیں ہوتا، اور نہ کسی متوفی کے ترکہ میں اس سے قبل مرجانے والے کسی ممکن وارث کا حصہ زندہ شمار کیا جاتا ہے۔ اس فارمولے کو آپ نے ہندو و واجی قانون سے لیا ہو، یا فرانسیسی قانون وراثت سے اخذ کیا ہو، ہمارے نظام قانون کے لیے بہر حال بالکل اجنبی چیز ہے، جیسا کہ اوپر ہم واضح کر چکے ہیں۔

یہ غلطیاں اگر آپ محض اپنے دیہی علاقے کے وڈروں (یا صوبے کے عوام) کو خوش کرنے کے لیے کر رہے ہیں تو قطع نظر اس سے کہ خدا و رسول کی رضا کو قربان کر کے وڈروں کو خوش کرنا شرک کی ایک بدترین صورت ہے، ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ آپ کی تہیم کے دور رس اثرات تہیم پوتے کے علاوہ جب نو اسیوں اور بھتیجیوں بھتیجیوں اور بھانجیوں بھانجیوں، دامادوں اور بہوؤں کو بیٹوں کی موجودگی میں وارث بنائیں گے تو اس وقت آپ کے وڈر سر پیٹ لیں گے۔ بعید نہیں کہ یہ قدم آگے چل کر آپ کو واپس لینا پڑے۔

آخر میں ہم یہ بھی کہنا ضروری سمجھتے ہیں کہ چیمبر صاحب ہوں، یا کوئی اور بزرگ، انہیں مسلمانوں کی اکثریت کے نظام فقر و قانون سے ذاتی طور پر کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو، اور وہ منکرین حدیث بلکہ مرکے

منکرین دین کے نظریات پر ایمان کیوں نہ لے آئیں، قانون سازی کے اختیارات کو استعمال کرتے وقت ان کو یہ سوچنا چاہیے کہ یہ اختیارات ان کے پاس جس قوم کی طرف سے ایک مقدس امانت بنا کر سونپے گئے ہیں اس کا مسئلہ نظام فقہ و قانون آپ کے پسندیدہ نظریے اور آپ کی مجوزہ ترمیم کے حق میں نہیں ہے۔ اب اگر اسمبلی میں شریعت پر اعتماد نہ رکھنے والے یا اس کو نہ جاننے والے لوگ محض اپنی اتفاقی اکثریت کے زور سے قوم پر منکرین حدیث کے نظریہ و مسلک کو منڈھ دیں تو یہ ظلم ہوگا، اور اس کے خلاف لازماً احتجاج کیا جائے گا۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ جس نئے تصور شریعت کو آپ پسند کرتے ہوں، پہلے اس پر رائے عام تیار کریں اور اسی کے نام پر منتخب ہوں، پھر آپ کو حق ہوگا کہ من مانی شریعت وضع کریں۔

بہتر یہ ہو کہ قانون شریعت کو آپ حضرات سیاسی مقاصد کی بساط کا داؤں نہ بنائیں۔ معقول طریقہ یہ ہے کہ اسلامی قانون کے ماہرین رجو مختلف مدرسہ ہائے فکر سے تعلق رکھتے ہوں، ان کی ایک مجلس منظم کر کے آپ اس قسم کے مسائل کو اس مجلس کے سامنے فکر و تحقیق کے لیے پیش کرنے کا راستہ نکالیں، تاکہ بات بات پر بے جا ذہنی کشمکش اور نظریاتی تصادم پیدا نہ ہو۔